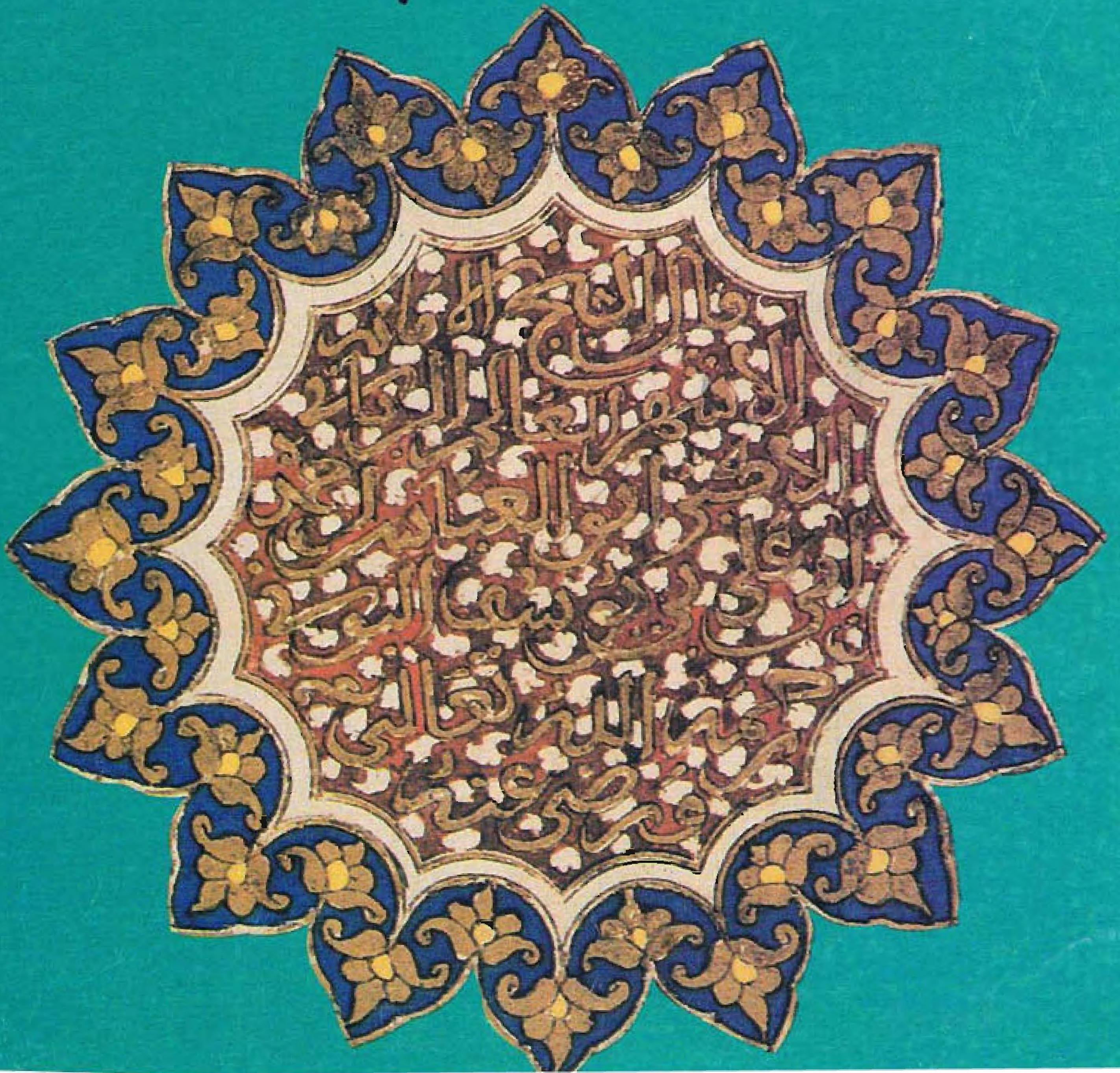
الرسالہ
Al-Risala

July 1999 • No. 272 • Rs. 9

اعلیٰ انسانیت کا اصول دو لفظ میں یہ ہے —
سادہ زندگی اور اونچی سوچ۔



عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن (مکمل)	400.00
اسلام: ایک تعارف	80.00
اللہ اکبر	45.00
پیغمبر انقلاب	50.00
مذہب اور جدید چیلنج	55.00
عظمت قرآن	35.00
عظمت اسلام	50.00
عظمت صحابہ	7.00
دین کامل	60.00
الاسلام	45.00
ظہور اسلام	50.00
اسلامی زندگی	40.00
احیاء اسلام	35.00
راز حیات	65.00
صراط مستقیم	40.00
خاتون اسلام	60.00
سوشلزم اور اسلام	50.00
اسلام اور عصر حاضر	30.00
الربانیہ	40.00
کاروان ملت	45.00
حقیقت حج	30.00
اسلامی تعلیمات	35.00
اسلام دور جدید کا خالق	25.00
حدیث رسول	40.00
سفر نامہ (غیر ملکی اسفار)	85.00
راہ عمل	25.00
تعبیر کی غلطی	80.00
دین کی سیاسی تعبیر	20.00
عظمت مومن	7.00
اسلام ایک عظیم جدوجہد	5.00
تاریخ دعوت حق	5.00

مطالعہ سیرت (کتابچہ)	12.00
ڈائری (جلد اول)	80.00
کتاب زندگی	65.00
اقوال حکمت	25.00
تعمیر کی طرف	8.00
تبلیغی تحریک	20.00
تجدید دین	25.00
عقلیات اسلام	35.00
قرآن کا مطلوب انسان	8.00
دین کیا ہے؟	7.00
اسلام دین فطرت	7.00
تعمیر ملت	7.00
تاریخ کا سبق	7.00
فسادات کا مسئلہ	5.00
انسان اپنے آپ کو پہچان	5.00
تعارف اسلام	5.00
اسلام پندرہویں صدی میں	5.00
راہیں بند نہیں	12.00
ایمانی طاقت	7.00
اتحاد ملت	7.00
سبق آموز واقعات	7.00
زلزلہ قیامت	10.00
حقیقت کی تلاش	8.00
پیغمبر اسلام	5.00
آخری سفر	7.00
اسلامی دعوت	7.00
حل یہاں ہے	10.00
سچا راستہ	8.00
دینی تعلیم	7.00
امہات المومنین	20.00
تصویر ملت	85.00

دعوت اسلام	50.00
دعوت حق	40.00
نشری تقریریں	80.00
دین انسانیت	60.00
فکر اسلامی	50.00
شتم رسول کا مسئلہ	50.00
طلاق اسلام میں	5.00
مضامین اسلام	60.00
حیات طیبہ	7.00
باغ جنت	7.00
نار جہنم	7.00
خلیج ڈائری	10.00
رہنمائے حیات	7.00
تعدد ازدواج	7.00
ہندستانی مسلمان	50.00
روشن مستقبل	7.00
صوم رمضان	7.00
اسلام کا تعارف	4.00
علما اور دور جدید	8.00
سفر نامہ اسپین و فلسطین	60.00
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	12.00
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	8.00
یکساں سول کوڈ	5.00
اسلام کیا ہے؟	8.00
میوات کا سفر	35.00
قیادت نامہ	35.00
مطالعہ سیرت	60.00
منزل کی طرف	4.00
اسباق تاریخ	85.00

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خصوصی شمارہ: تعمیر ہند

فہرست

نئی کتابیں





الرسالہ
Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
skhan@vsnl.com
http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

فہرست

Tamir-e-Hind by Maulana Wahiduddin Khan
First Published 1999

No Copyright

Al-Risala 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128 Fax 4697333, 4647980
E-mail: skhan@vsnl.com http://www.alrisala.org

تاریخ کو انتظار ہے

ہندوؤں کا ایک طبقہ ہندستانی مسلمانوں کو ملک کے لئے اثاثہ (asset) کے روپ میں نہیں دیکھ پاتا۔ اس کے بجائے وہ ان کو ایک بوجھ (liability) کے روپ میں دیکھتا ہے۔ یہ نظریہ قانون فطرت کے خلاف ہے۔ یہ کسی اقلیت کے اس فطری کردار کی نفی ہے جو اس کے لئے فطرت کے اٹل قانون کے تحت مقدر ہے۔

انگریز مؤرخ آرنلڈ ٹوائن بی نے اپنی مشہور کتاب اسٹڈی آف ہسٹری میں تاریخی شواہد کے ساتھ بتایا ہے کہ یہ اقلیتیں ہی ہیں جو ہمیشہ کسی ملک میں کوئی انقلابی کردار ادا کرتی ہیں۔ اور ہندستان کی مسلم اقلیت بلاشبہ اس معاملہ میں کوئی استثناء نہیں۔

امام النسائی کی روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی ایک پیشین گوئی میں فرمایا کہ میری امت کے دو گروہ ایسے ہیں جن کو اللہ نے آگ کے عذاب سے محفوظ کر دیا ہے۔ ایک گروہ وہ جو ہند میں غزوہ کرے گا۔ اور دوسرا گروہ وہ جو عیسیٰ بن مریم کے ساتھ ہوگا (**عصابتان من امتی احرزهما الله من النار: عصابة تغزو الهند وعصابة تكون مع عيسىٰ ابن مريم) جامع الاصول فی احادیث الرسول، الجزء التاسع، ۲۰۲۔**

میرے نزدیک اس حدیث میں یہ پیشین گوئی کی گئی ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ ہندستان کے مسلمان اس ملک میں ایک اہم تعمیری کردار ادا کریں گے۔ وہ اس ملک کو حقیقی عظمت اور ترقی کا مقام دلانے کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ وقت اب آخری طور پر آگیا ہے۔

اس پیغمبرانہ پیشین گوئی کی تکمیل کے لئے ہندستانی مسلمانوں کو کیا کرنا ہے۔ انھیں صرف یہ کرنا ہے کہ وہ اس ملک میں احتجاجی گروہ کے طور پر رہنے کا انداز چھوڑیں اور تخلیقی گروہ

(creative group) بن کر رہنا سیکھیں۔ وہ لینے والے گروہ نہ رہیں بلکہ وہ اس ملک میں دینے والے گروہ بن جائیں۔ اور یہی اسلام کا تقاضا ہے۔ اس کے بعد ملک میں ایک نیا دور آ جائے گا۔ جب کہ ہندستان ایک ترقی یافتہ ملک کے روپ میں ابھرے گا اور دنیا کے نقشہ میں اپنا وہ مقام حاصل کرلے گا جو اس کے لئے مقدر ہے۔

سوامی وویکا نند نے ۱۸۹۸ میں کہا تھا کہ مستقبل کا ہندستان ایک پر عظمت ہندستان (glorious India) ہوگا اور اس پر عظمت ہندستان کی تعمیر ہندو اور مسلمان دونوں مل کر کریں گے۔ یہ بات بلا شبہ درست ہے مگر ہندو اور مسلمان دونوں کو یہ تاریخی کردار ادا کرنے کے لئے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرنا ہوگا۔ ضروری اہلیت کے بغیر دونوں میں سے کسی کے لئے بھی اس تاریخی کردار کو انجام دینا ممکن نہیں۔

ہندوؤں میں سے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ملک ان کے نام الاٹ کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک خطرناک قسم کی غلط فہمی ہے۔ اس ذہن کے ساتھ ان کے لئے اپنا مطلوب کردار ادا کرنا ممکن نہیں۔ ہندو بلا شبہ اس ملک میں اکثریتی فرقہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر ہر اکثریت آخر کار فطرت کے اٹل قانون کے تحت ہے نہ کہ اس سے آزاد۔ اس دنیا میں ہر اکثریت اسی طرح فطرت کے قانون کے تابع ہے جس طرح کوئی اقلیت۔

ہندوؤں کو یہ کرنا ہوگا کہ مسلمانوں کو وہ سادہ طور پر محض عددی تناسب کے نقطۂ نظر سے نہ دیکھیں بلکہ وہ انھیں اپنا فطری شریک کار سمجھیں۔ وہ مسلمانوں کو ہندستانی گاڑی کے دوسرے پہیہ کی حیثیت سے قبول کریں۔ اس کے بغیر ملک میں کوئی حقیقی ترقیاتی عمل شروع نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھیں کہ مذکورہ حدیث رسول کے مطابق، اس ملک میں انھیں جو تعمیری رول ادا کرنا ہے اس کی لازمی شرط بھی یہی اہلیت ہے۔

مسلمان اس اہم کردار کی ادائیگی کے اہل صرف اس وقت بن سکتے ہیں جب کہ وہ اپنے آپ میں وہ ضروری لیاقت پیدا کریں جس کو تخلیقیت (creativity) کہاجاتا ہے۔

تخلیقی گروہ وہ ہے جو منفی طرز فکر سے پاک ہو اور معاملات کو صرف مثبت انداز سے دیکھے۔ جو دوسروں کے ساتھ تعلقات میں بلند نظری کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ تنگ نظری کا طریقہ۔ جو اپنے حقوق سے زیادہ اپنی ڈیوٹی پر نظر رکھتا ہو۔ جو اپنے جذبات سے زیادہ دوسروں کے جذبات کا احترام کرنا جانتا ہو، جو اشو اور نان اشو میں فرق کرے اور صرف ان چیزوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے جو تعمیر و ترقی کے عمل کے لئے حقیقی اشو کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تخلیقی گروہ وہ ہے جو گروہی ذہنیت سے پاک ہو اور معاملات کو انسانیت کے نقطۂ نظر سے دیکھے۔ جس کے دل میں دوسروں کے لئے خیر خواہی ہو نہ کہ نفرت و حقارت۔ جس کا تحمل کا مزاج اس کو اتنا اوپر اٹھادے کہ وہ اشتعال انگیز چیزوں پر بھی مشتعل نہ ہو۔ جو اعلیٰ مقصد کے لئے جینے والا ہو نہ کہ محض ذاتی مفاد کے لئے جینے والا۔

تخلیقی گروہ وہ ہے جو اپنی اعلیٰ صفات کی بنا پر اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ مسلسل طور پر ذہنی اور فکری ترقی کرتا رہے۔ وہ اس قابل ہو کہ مسائل کا نیا اور برتر حل دریافت کرلے۔ وہ زندگی کے ہر بند دروازہ کو کھولتا ہوا آخری منزل تک پہنچ جائے۔ کوئی بھی چیز اس کے سفر کو روکنے والی ثابت نہ ہو۔

یہی وہ صفات ہیں جن کو قرآن میں خلق عظیم (القلم۔ ۴) کہا گیا ہے۔ یعنی بلند نظری اور بلند کرداری۔ بلند نظر اور بلند کردار لوگ ہی اس دنیا میں کوئی بڑا کام کرتے ہیں۔ اس دنیا کے لئے فطرت کا قانون یہ ہے کہ چھوٹے کردار کے لوگ چھوٹا کام انجام دیں اور بڑے کردار کے لوگ بڑا کام۔

اہل اسلام کو دین کی صورت میں جو نعمت ملی ہے وہ کسی ایک گروہ کی وراثت نہیں۔ وہ ساری انسانیت کا مشترک سرمایہ ہے۔ دوسرے انسانوں تک اس سرمایہ کو پہنچانا ایک خدائی امانت

کی ادائیگی کا معاملہ ہے۔ اور صرف اسی جذبہ کے تحت اس کو صحیح طور پر انجام دیا جاسکتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم زمانہ کا انسان ہزاروں سال تک کوئی بھی علمی یا تہذیبی یا تمدنی ترقی نہ کرسکا۔ تمام قابل ذکر ترقیاں اسلام کے ظہور کے بعد شروع ہوئیں۔

اس وقت کی دنیا مخلوقات کی پرستش میں پھنسی ہوئی تھی، اہل اسلام نے اس کو مخلوقات کی پرستش سے اوپر اٹھا کر خالق کی پرستش کا راستہ دکھایا۔ لوگ فطرت کے مظاہر کو مقدس مان کر اس کے سامنے صرف اظہار عقیدت کرنا جانتے تھے، اہل اسلام نے اس کے بجائے ان کے اوپر فطرت کی تسخیر کا دروازہ کھولا۔ لوگ دولت اور اقتدار کو معبود کا درجہ دے کر اسی کو اپنا سب کچھ سمجھے ہوئے تھے۔ اہل اسلام نے دولت اور اقتدار کو ضرورت اور خدمت کے خانے میں ڈال کر انسان کو عظمت کا درجہ عطا کیا۔ لوگ اپنے مفروضہ عقائد کی بنا پر طرح طرح کے توہمات (superstitions) میں مبتلا تھے، اہل اسلام نے ان کو مفروضات اور توہمات سے نکال کر حقائق کی سطح پر سوچنے والا بنایا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب "اسلام دور جدید کا خالق")

فکر انسانی میں یہ انقلاب پہلی بار اہل اسلام یا اہل توحید کے ذریعہ وقوع میں آیا۔ اس فکری انقلاب نے انسانیت کے اوپر تعمیر و ترقی کا وہ دروازہ کھول دیا جو ہزاروں سال سے اس کے اوپر بند پڑا ہوا تھا۔

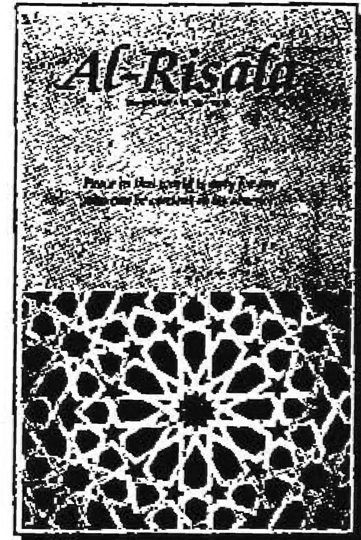
قدیم زمانہ کا انسان مشرکانہ افکار میں جیتا تھا۔ زندگی کا ہر شعبہ شرک کے ماتحت ہو گیا تھا۔ شرک اپنی حقیقت کے اعتبار سے توہم پرستی کا نام ہے۔ اور توہم پرستانہ مزاج، بالفاظ دیگر غیر سائنٹفک مزاج، کے ساتھ کبھی کوئی حقیقی ترقی نہیں ہو سکتی۔ اہل اسلام کی صورت میں دنیا کو پہلی بار ایک ایسا انسانی گروہ ملا جس کا فکر خالص توحید پر مبنی تھا، وہ شرک اور توہم پرستی سے پوری طرح آزاد تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کے ذریعہ دنیا کو پہلی بار حقیقت پسندی کا سبق ملا۔ لوگوں کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ توہمات سے آزاد ہو کر فطری قوانین کی بنیاد پر اپنی زندگی کی تشکیل کریں۔ اسلام

کا یہی وہ خاص عطیہ ہے جس نے انسانیت کی تاریخ کو ترقی کے نئے دور میں داخل کر دیا۔

ہندستان کی جدید تاریخ بھی اہل اسلام کے اسی توحیدی رول کا انتظار کر رہی ہے۔ اس ملک کی ترقی ٹھیک اسی مقام پر رکی ہوئی ہے جہاں بقیہ دنیا کی ترقی ماضی میں رکی ہوئی تھی۔ اس ملک میں ترقی کا نیا عمل عین اسی مقام سے شروع ہوگا جہاں سے وہ بقیہ دنیا میں پچھلے ہزاروں سال کے دوران شروع ہوا تھا۔ ہندستان میں بھی بقیہ دنیا کی تاریخ کا اعادہ ہونا ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسری چیز اس ملک کو حقیقی ترقی کی طرف لے جانے والی نہیں۔

AL-RISALA represents a mission, the aims and objectives of which are to proclaim a divine message. It is a voluntary effort, which belongs to everyone who is in accord with the message it proclaims. Such people are invited to join us in this divine cause. And assist in conveying the truth to those around them.

God has entrusted you with a message to be communicated to the rest of the world. Are you ready to fulfill the trust?



Gift AL-RISALA to your friends and relatives.

Subscribe NOW!

Ask for a free specimen copy.

'INTRODUCTION TO ISLAM' SERIES

In this 'Introduction to Islam' series Maulana Wahiduddin Khan—a famous Islamic thinker and scholar and President of the Islamic Centre, New Delhi—has presented the fundamental teachings of Islam in a simple way. The complete series is as follows:

1. The Way to Find God (20 pages)
2. The Teachings of Islam (46 pages)
3. The Good Life (36 pages)
4. The Garden of Paradise (48 pages)
5. The Fire of Hell (48 pages)

ہندو مسلم اتحاد

ہندستان کی قومی جدوجہد کے دو دور ہیں۔ پہلا دور ۱۹۴۷ سے پہلے کا ہے اور دوسرا دور ۱۹۴۷ کے بعد کا۔ پہلے دور میں سیاسی آزادی کا نشانہ تھا جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو پورا ہوا۔ دوسرے دور میں ملک کی تعمیر نو کا نشانہ تھا جس کو سیاسی آزادی کے بعد انجام پانا تھا۔ عجیب بات ہے کہ پہلے دور کا نشانہ مکمل طور پر پورا ہوا لیکن دوسرے دور کا نشانہ اتنا زیادہ ناکام رہا کہ ۵۰ سال گزرنے کے بعد بھی اس کی منزل دکھائی نہیں دیتی۔

پہلے دور کا نشانہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد کے ذریعہ پورا ہوا تھا۔ اسی طرح دوسرے دور کے نشانہ کی تکمیل کے لئے بھی ضروری تھا کہ ہندو اور مسلمان مل کر اس کے لئے جدوجہد کریں۔ اس معاملہ کی اہمیت کو مہاتما گاندھی پوری طرح سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی رات کو تمام لیڈر دہلی میں اکٹھا ہو کر یہ انتظار کر رہے تھے کہ کب گھڑی کی سوئی ۱۲ پر پہنچے کیونکہ ۱۲ بج کر ایک منٹ پر انگریز وائسرائے آل انڈیا ریڈیو پر ہندستان کی آزادی کا اعلان کرنے والا تھا۔ لیکن گاندھی واحد لیڈر تھے جو اس وقت دہلی میں موجود نہ تھے، وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے گاؤں گاؤں کا دورہ کر رہے تھے۔ گاندھی کی نظر مستقبل پر تھی، اور بقیہ لیڈروں کی نظر صرف آج پر۔

مہاتما گاندھی اس فرقہ وارانہ اتحاد کو اتنا زیادہ اہمیت دیتے تھے کہ لوئی فشر کے بیان کے مطابق، انھوں نے اعلان کیا کہ۔۔۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو یہ سیکھنا ہوگا کہ وہ کس طرح امن اور میل ملاپ کے ساتھ رہیں۔ ورنہ میں اسی کوشش میں اپنی جان دے دوں گا:

Hindus and Musalmans should learn to live together in peace and amity otherwise I should die in the attempt(p449)

مہاتما گاندھی کا یہ مشن ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ آزادی کے بعد بہت جلد انھیں گولی مار

کر ہلاک کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو ہوا۔ اس وقت میں اعظم گڑھ میں تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے مسٹر سکلدیپ سنگھ (پرنسپل ڈی اے وی کالج) رہتے تھے۔ اگلی صبح کو وہ ہمارے یہاں آئے اور کہا کہ آج میں نے بہت سے اخباروں میں مہاتما گاندھی کے قتل کی رپورٹ پڑھی۔ اس واقعہ کی سب سے بہتر سرخی وہ ہے جو امرت بازار پتریکا (الہ باد) نے لگائی ہے۔ اس کی سرخی یہ تھی۔ گاندھی مذہبی جنون کے ہاتھوں ہلاک:

Gandhi sacrificed by fanaticism

جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہی واقعہ ہندستانی تاریخ کے دونوں دوروں کے درمیان حد فاصل بن گیا۔

۱۹۴۷ سے پہلے ملکی آزادی کی جدوجہد کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ کوشش نے کامیاب بنایا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں ایک طرف مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو جیسے بہت سے ہندو لیڈر ہیں جو آزادی کی تحریک میں بھرپور طور پر شامل ہیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کی بڑی بڑی شخصیتیں بھی اس تحریک کی اگلی صف میں شریک ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، خان عبدالغفار خاں، وغیرہ۔ آزادی کی پوری جدوجہد میں ہندو مسلمان دونوں اسی طرح مل کر قربانیاں دیتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ جدوجہد اپنی تکمیل تک پہنچ گئی۔

مگر آزادی (۱۹۴۷) کے بعد اچانک ایک بالکل مختلف منظر دکھائی دیتا ہے۔ اب ملک کے سامنے قومی تعمیر کے لئے جدوجہد کرنے کا مسئلہ تھا۔ مگر اس دوسرے مرحلہ میں مسلمان اچانک الگ تھلگ دکھائی دیتے ہیں۔ آزادی کے بعد ملکی تعمیر کے لئے دوبارہ ایک لمبی اور متحدہ کوشش درکار تھی مگر یہ متحدہ کوشش وجود میں نہ آسکی۔ آزادی سے پہلے جو ہندو اور مسلمان باہم مل کر کام کر رہے تھے۔ وہ آزادی کے بعد نہ صرف الگ ہوئے بلکہ ان کے درمیان وہ تباہ کن سلسلہ شروع ہو گیا جس کو فرقہ وارانہ فساد کہا جاتا ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ہماری قومی جدوجہد کے دوسرے مرحلہ کا ناکام رہنا سب سے زیادہ اسی بنا پر ہوا ہے۔ نئے دور کی تعمیری جدوجہد کے لئے دوبارہ متحدہ کوشش درکار تھی۔ چونکہ اس دوسرے مرحلہ میں متحدہ کوشش وجود میں نہ آسکی اس لئے قدرتی طور پر وہ ناکام بھی رہی۔

یہ المیہ کیوں پیش آیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے جو مشترک جدوجہد جاری ہوئی اس میں ہندوؤں کی طرف سے زیادہ تر سیکولر لوگ شریک تھے۔ یہ ہندو اپنے مزاج کی بنا پر اپنے مذہب یا اپنے مخصوص مذہبی رسوم کو اجتماعی معاملات میں داخل نہیں کرتے تھے۔ اس بنا پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی اجنبیت حائل نہیں ہوتی تھی۔ دونوں کھلے دل کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتے تھے اور کسی توحش کے بغیر مل کر کام کرتے تھے۔ یہ "سیکولر کلچر" بنیادی طور پر دونوں فرقوں کے درمیان اتحاد کی طاقتور کڑی بنا رہا۔

آزادی کے بعد جب مہاتما گاندھی کو قتل کر دیا گیا تو اس کے بعد ہندوؤں کا وہ طبقہ ابھرنا شروع ہو گیا جو سیکولرزم کے بجائے ہندتو میں یقین رکھتا تھا۔ یہ لوگ ابتدا میں اتنے محدود تھے کہ آزادی کے بعد جب پہلی پارلیمنٹ بنی تو اس میں ان کے صرف دو ممبر شامل ہو سکے جو جن سنگھ کے ٹکٹ پر کامیاب ہو کر آئے تھے۔ یہ تعداد دھیرے دھیرے بڑھتی رہی یہاں تک کہ ۱۹۹۸ میں وہ اس پوزیشن میں ہو گئے کہ نئی دہلی کی مرکزی حکومت پر قبضہ حاصل کر لیں۔ ابتدا میں یہ لوگ صرف محدود دائرہ میں اپنا اثر رکھتے تھے مگر دھیرے دھیرے ان کے اثرات ہندو سماج کے بڑے طبقہ تک پھیل گئے۔

۱۹۴۷ سے پہلے جب ہندو اور مسلمان اجتماعی مواقع پر ملتے تھے تو دونوں سیکولر آداب کے تحت ملتے تھے۔ اس بنا پر دونوں کے درمیان کوئی کشیدگی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اب دوسرے دور میں یہ ہوا کہ مسلمان اگر کسی اجتماعی پروگرام میں جاتے تو وہاں ان کو ملاقات کے وقت

مصافحہ کرنے کے بجائے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے کا ماحول ملتا تھا۔ پروگرام کا آغاز وندے ماترم کے گیت یا سرسوتی دیوی کی وندنا سے ہوتا تھا۔ اسی طرح پروگرام کے شروع میں ہندو رسم کے مطابق دیا جلا کر اس کا شبھ آرمبھ کیا جاتا تھا یا سنسکرت اشلوک پڑھے جاتے تھے۔ اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں جو نئے دور کے اجتماعی مواقع پر بھارتیہ سنسکرتی کے نام پر شامل کر دی گئیں۔

اس قسم کی تمام چیزیں خواہ دھرم کے نام پر کی جائیں یا سنسکرتی کے نام پر، ہر حال میں وہ مسلمانوں کے لئے صرف دوری کا سبب بن سکتی تھیں، اور واقعہ میں ایسا ہی ہوا۔ اس قسم کے تمام رسوم یا اس طرح کے تمام کلمات قدیم مشرکانہ عقائد پر مبنی ہیں۔ خواہ ان کا کوئی بھی خوبصورت نام دیا جائے مگر ان کے مبنی بر شرک ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمان چونکہ ایک خدا کو مانتے ہیں، اس لئے ان کا موحدانہ مزاج اس قسم کے پروگراموں میں شرکت کے لئے ایک مستقل روک بن گیا۔ ان کے لئے ناممکن ہو گیا کہ وہ ایسے اجتماعی مواقع پر کھلے دل سے شریک ہو سکیں جس میں بھارتیہ سنسکرتی کے نام پر ان مشرکانہ رسوم کو ادا کیا جا رہا ہو۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی سے پہلے قومی جدو جہد کی جو گاڑی اپنے دو پہیوں (ہندو اور مسلمان) کے ذریعہ چل رہی تھی، وہ اب بڑی حد تک صرف ایک پہیہ (ہندو) کے ذریعہ چلنے لگی۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، کوئی گاڑی جس کے دو پہیوں میں سے ایک پہیہ نکال دیا جائے وہ کھڑی تو ہو سکتی ہے مگر اپنے راستہ پر تیز رفتاری کے ساتھ چل نہیں سکتی۔ چنانچہ قانون فطرت کے تحت ہماری قومی تعمیر کی گاڑی بھی چلتے چلتے اچانک ٹھہر گئی۔ قومی تعمیر کا سارا منصوبہ ناکام ہو کر رہ گیا۔

اب بیسویں صدی کے خاتمہ پر آخری طور پر وہ وقت آگیا ہے جب کہ ہند تو لیڈر شپ یہ جان لے کہ دونوں فرقوں کی متحدہ کوشش کے بغیر ملک کی حقیقی تعمیر ممکن نہیں۔ ملکی

تعمیر کے معاملہ میں ان حضرات کے سامنے جن دو کے درمیان انتخاب (option) ہے وہ یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ جدو جہد یا مسلمانوں کے بغیر جدو جہد۔ بلکہ ان کے لئے اصل انتخاب دوسری دو صورتوں کے درمیان ہے، اور وہ ہے ۔۔۔ مسلمان کے ساتھ جدو جہد یا سرے سے جدو جہد ہی نہیں۔

اس پیچیدہ مسئلہ کا حل کیا ہے۔ وہ حل یہ ہے کہ برادران وطن کی ہندتو لیڈر شپ بھی اسی طریقہ کو اختیار کرے جس کو اس سے پہلے ان کی سیکولر لیڈر شپ نے اختیار کیا تھا۔ یعنی وہ چیز جس کو وہ بھارتیہ سنسکرتی کہتے ہیں، اس کو مکمل طور پر اجتماعی پروگراموں اور سرگرمیوں سے الگ کر دیا جائے۔ اگر وہ چاہیں تو اپنے ذاتی دائرہ میں اس کو اختیار کر سکتے ہیں مگر اجتماعی دائرہ کے تمام مواقع سے مکمل طور پر اس کو حذف کر دیا جائے۔ یہی واحد تدبیر ہے جس کے ذریعہ دوبارہ اس ہندو مسلم مشترک جدو جہد کو زندہ کیا جا سکتا ہے ۔۔ جس نے پہلے مرحلہ میں ہماری قومی جدو جہد کو کامیاب کیا تھا اور جو دوسرے مرحلہ میں بھی ہماری قومی جدو جہد کی کامیابی کی واحد ضمانت ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی سماج میں اتحاد ہی تمام ترقیوں کا واحد ضامن ہے۔ جب سماج کے تمام طبقات مل کر کام کرتے ہیں اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ ان کے درمیان وہ متحدہ کوشش وجود میں آئے جو کسی بھی بڑے کام کے لئے ضروری ہے۔

یہ فطرت کا قانون ہے، یہ تاریخ کا فیصلہ ہے۔ اور ہم جتنی جلد اس حقیقت کو جان لیں اتنا ہی اچھا ہے۔ اس حقیقت سے بے خبری یا اس کا عدم اعتراف ایک ایسی تباہ کن غلطی ہوگی جس کو ہماری اگلی نسلیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔

اس بات کی وضاحت کے لئے یہاں میں ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔ دھلی میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو ہیں۔ وہ لمبی مدت تک ایک بڑی کمپنی میں بزنس منیجر کے طور پر کام کرتے

رہے۔ اپنے پچیس سالہ تجربہ اور مطالعہ کی بنیاد پر انھوں نے بزنس مینجمنٹ کے موضوع پر ایک کتاب (۳۱۶ صفحات) انگریزی میں لکھی جس کا نام انتظامی افکار (Management Thoughts) تھا۔ میں نے یہ کتاب دیکھی ہے وہ بلا شبہ ایک کامیاب کتاب ہے اور ہر قسم کے لوگوں کے لئے بہترین تجارتی گائڈ ہے، خواہ وہ کسی بھی مذہب یا فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۹۱ میں چھپی۔ مصنف نے اس کو دہلی کی بک فیئر میں رکھا مگر وہاں وہ بہت کم تعداد میں فروخت ہو سکی۔ اتنی کامیاب اور قابل مطالعہ کتاب بک فیئر میں ناکام کیوں رہی، اس کی وجہ صرف ایک تھی۔ وہ یہ کہ انھوں نے ٹائٹل پر کتاب کے نام کے نیچے ہندو دیوتا گنیش کی رنگین تصویر بنائی۔ یہ تصویر ٹائٹل کے تقریباً تین چوتھائی حصہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو شخص بھی ان کے اسٹال پر آتا وہ کتاب کا ٹائٹل دیکھ کر آگے بڑھ جاتا۔ گنیش جی کی تصویر کو دیکھ کر وہ یہ سمجھتا کہ یہ شاید ہندو مائتھالوجی سے متعلق کوئی کتاب ہے۔ اس بنا پر چند مذہبی ہندو ہی اس کتاب سے دلچسپی لے سکے، بقیہ لوگ اس کے ظاہر کو دیکھ کر ہی اس سے بے رغبت ہو گئے اور اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔

اس واقعہ کا علم مذکورہ ہندو کے ایک مسلمان دوست کو ہوا۔ مسلمان نے اس مسئلہ پر غور کیا اور مذکورہ ہندو مصنف کو یہ مشورہ دیا کہ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں کتاب کے اس ٹائٹل (گرد پوش) کو بدل دوں۔ ہندو مصنف نے اجازت دے دی۔ اس کے بعد مذکورہ مسلمان پبلیشر نے صرف یہ کیا کہ اس مجلد کتاب کے لئے ایک نیا گرد پوش چھپوایا۔ اس نئے گرد پوش پر صرف کتاب کا نام (Management Thoughts) جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے حسب قاعدہ مصنف کا نام تھا۔ گرد پوش کے بقیہ حصہ پر انھوں نے کچھ تجارتی اقوال لکھ دیے جو اسی کتاب سے لئے گئے تھے۔ مثال کے طور پر:

Our attitude determines our altitude.

اگلے سال یہ کتاب دوبارہ دہلی کی بک فیئر میں رکھی گئی۔ کتاب وہی تھی، صرف اس کا ٹائٹل بدل دیا گیا تھا۔ اس تبدیلی کا نتیجہ نہایت شاندار نکلا۔ لوگ آتے اور کتاب کو ہاتھ میں لے کر اس کو الٹتے پلٹتے اور پھر شوق کے ساتھ اس کو خرید لیتے۔ یہ بک فیئر ایک بین اقوامی نمائش تھی چنانچہ دوسرے ملکوں کے لوگ بھی یہاں آئے ہوئے تھے۔ مصنف نے بتایا کہ اب نہ صرف ہندستانیوں نے اس کتاب کو خریدا بلکہ پاکستان اور عرب اور دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے لوگوں نے بھی نہایت شوق کے ساتھ اس کو حاصل کیا۔ بک فیئر کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی کتاب کا پورا اسٹاک ختم ہو چکا تھا۔

اب مذکورہ ہندو اور مسلمان دونوں نے مزید کتابیں چھاپی ہیں اور وہ مل کر یہ کام کر رہے ہیں۔ ان کا یہ کتابی بزنس پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ وہ نہ صرف ملکی مارکیٹ میں کامیاب ہیں بلکہ وہ بیرونی ملکوں میں بھی اپنی کتابوں کو بڑی تعداد میں اکسپورٹ کر رہے ہیں۔

اس واقعہ پر غور کیجئے تو یہ اہم نکتہ معلوم ہوگا کہ اتحاد کس طرح ترقی کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مصنف کے پاس تجارتی معلومات کا ذخیرہ تھا مگر اپنے مخصوص مذہبی ذہن کی بنا پر وہ ایک محدودیت کا شکار ہو گئے۔ وہ اس راز کو سمجھ نہ سکے کہ وہ اپنے مخصوص ذہن کی بنا پر تو گنیش جی کو خود تو مشکل کشائی کا دیوتا سمجھتے ہیں مگر دوسری قوموں اور دنیا کے بیشتر لوگوں کے نزدیک گنیش جی صرف ایک دیومالائی شخصیت ہیں، نہ کہ کوئی حقیقی شخصیت۔

مذکورہ مسلمان اپنی اسلامی تربیت کی بنا پر اس نفسیاتی پیچیدگی سے خالی تھا۔ اس کے نزدیک مشکل کشائی یا تجارتی کامیابی کا تعلق کسی دیوی یا دیوتا سے نہ تھا۔ اس بنا پر وہ اس پوزیشن میں تھا کہ معاملہ پر کھلے ذہن کے ساتھ سوچے، وہ اس کے بارے میں حقیقت پسندانہ رائے قائم

کر سکے۔ چنانچہ اس نے ہندو مصنف کو ایک ایسا مشورہ دیا جو مکمل طور پر حقیقت پر مبنی تھا۔ اور اس دنیا کے لئے فطرت کا قانون یہ ہے کہ حقیقت پر مبنی منصوبہ کامیاب ہو اور تخیلات پر مبنی منصوبہ ناکام ہو کر رہ جائے۔

ضرورت ہے کہ اس انفرادی مثال کو پورے ملک میں قومی سطح پر دہرا یا جائے۔ یہاں کے ہر پروگرام اور ہر اجتماعی سرگرمی کو سیکولر بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ خواہ تعلیمی ادارے ہوں یا تجارتی ادارے، کوئی جلسہ ہو یا تقریب، کوئی سرکاری معاملہ ہو یا غیر سرکاری معاملہ ہر جگہ سیکولرزم کے اصول کو اختیار کیا جائے۔ ہندتو یا بھارتیہ سنسکرتی کو صرف ذاتی دائرہ میں محدود کر دیا جائے۔ اجتماعی عمل کے مواقع سے اس کو مکمل طور پر دور رکھا جائے۔

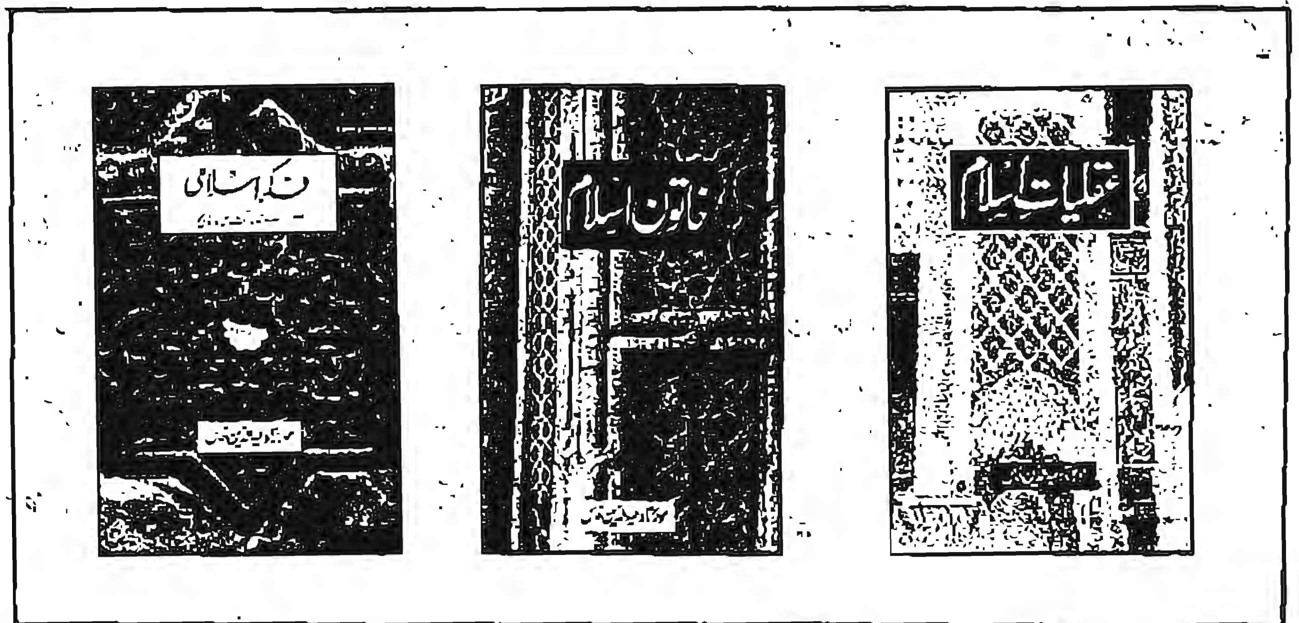
موجودہ دنیا میں جس ملک نے بھی کوئی بڑی ترقی کی ہے، اس نے اسی سیکولر اصول کو اختیار کر کے ترقی کی ہے۔ ہندستان کے لئے بھی کامیابی کا یہی واحد راستہ ہے۔ یہ معاملہ اتنا زیادہ حتمی ہے کہ اگر ہماری موجودہ نسل نے اس کو خوشی کے ساتھ قبول نہ کیا تو ہماری اگلی نسل بغاوت کر کے اس کو اختیار کرے گی۔ جو مذہب یا سنسکرتی ترقی کے عمل میں عقب لشکر (rear-guard) کا کام انجام دے اس کو ماڈرن انسان کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ اس سنگین حقیقت کو جس قدر جلد سمجھ لیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

ہندتو لیڈر شپ نے پہلے بھارتیہ سنسکرتی کو آداب و رسوم کی سطح پر ملکی زندگی میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے دیکھا کہ لوگ ان چیزوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے ہیں حتی کہ خود جدید تعلیم یافتہ ہندو بھی اس قسم کی رسوماتی چیزوں سے بیزار رہے۔ اس کے بعد ہندتو لیڈر شپ نے ایک اور فیصلہ کیا جو پہلے سے بھی زیادہ تباہ کن تھا۔ وہ یہ کہ ---لوگ اگر بھارتیہ سنسکرتی سے دلچسپی نہیں لے رہے ہیں تو لوگوں کے ذہن کو بدل کر انھیں ایسا بنایا جائے جو ان حضرات کی پسند کے مطابق ہو۔ یعنی جو انھیں کی طرح بھارتیہ سنسکرتی کو پسند کرنے لگے۔

اس مقصد کے لئے انھوں نے ایک طویل ایجنڈا بنایا ہے۔ بزعم خود وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایجنڈا ملک کو ترقی کی طرف لے جانے والا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ وقوع میں آجائے تو وہ ملک کو پیچھے دھکیلنے کے سوا کوئی کارنامہ انجام دینے والا نہیں۔

یہ ہندتوا ایجنڈا اب کھل کر سامنے آچکا ہے۔۔۔وہ ہے ملک کے تعلیمی نظام کو بھارتیہ سنسکرتی کے مطابق تشکیل دینا، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ اس سنسکرتی کا پرچار کرنا، دستور اور قانون کو بھارتیہ سنسکرتی پر ڈھالنا، ملک کی تاریخ کو دوبارہ اپنی مرضی کے مطابق لکھنا، ملک سے ان تمام آثار کو مٹانا جو بھارتیہ سنسکرتی کی یاد نہ دلاتے ہوں، غرض پورے ملک پر اس عمل کو انجام دینا جس کو عام طور پر بھارتیہ کرن کہا جاتا ہے۔

جو صاحبان اس قسم کا خواب دیکھ رہے ہیں انھیں جاننا چاہئے کہ وہ تاریخ کے پہیہ کو الٹا گھمانا چاہتے ہیں۔ وہ فطرت کے قانون سے لڑ رہے ہیں۔ وہ گلوبل نیشنلزم کے زمانہ میں محدود نیشنلزم کا جزیرہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی کسی کوشش کے لئے پیشگی طور پر یہ مقدر ہے کہ وہ سرے سے وقوع ہی میں نہ آئے۔ اس قسم کا منصوبہ بلاشبہ حقائق عالم کے خلاف ہے، اور حقائق عالم کی چٹان سے سر ٹکرا کر کوئی شخص اپنے سر کو توڑ تو سکتا ہے مگر وہ حقائق عالم کے رخ کو بدل نہیں سکتا۔



تباہ کن ذہنیت

پندرہ سال پہلے ہندستانی ٹی وی پر رامائن اور مہابھارت کے سیریل تفصیل سے دکھائے گئے تھے۔ اس زمانہ میں ایک ہندو تاجر نے مجھ سے کہا کہ یہ سیریل جو دکھائے جارہے ہیں وہ کوئی معمولی چیز نہیں۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ہندستانی سماج میں ایک نیا تہذیبی انقلاب آگیا ہے۔

مگر نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ رامائن اور مہابھارت کے سیریل ختم ہونے کے بعد ہی عملی طور پر ایک بالکل مختلف منظر سامنے تھا۔ ملک کے قدیم کلچر کی طرف دعوت دینے والی اس رنگین فلم کو بظاہر لوگوں نے دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ مگر اس کے بعد پورے ملک نے نہایت اطمینان کے ساتھ مغرب سے آنے والے جدید کلچر کو اختیار کر لیا۔۔۔ ہندی زبان کے بجائے انگریزی زبان لوگوں کے ذہنوں پر چھا گئی۔ نئی نسل نمستے اور نمسکار کے بجائے ہائے اور ہیلو کہنے لگی۔ جل جیرہ کو چھوڑ کر لوگ کوکا کولا پر ٹوٹ پڑے۔ دوردرشن سے زیادہ کیبل ٹی وی دیکھا جانے لگا۔ ہر نوجوان یہ خواب دیکھنے لگا کہ وہ کسی نہ کسی طرح امریکہ اور یورپ کے ملکوں میں پہنچ جائے، مغربی کمپنیوں کے لئے ملک کے دروازے کھول دئے گئے۔ بھارت کی روایتی تہذیب کی اہمیت لوگوں کی نظر میں گھٹ گئی۔ اس کے بجائے وہ جدید مغربی تہذیب کو زیادہ بڑی چیز سمجھنے لگے، وغیرہ وغیرہ۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ خود میرے ساتھ پیش آنے والے ایک واقعہ سے معلوم ہوتی ہے۔ جس زمانہ میں رامائن سیریل دکھائے جارہے تھے میرے ایک پڑوسی ہندو نے مجھے اس کو دیکھنے کی ترغیب دی۔ میں نے کہا کہ میرے پاس ٹی وی نہیں ہے۔ انھوں نے دعوت دی کہ میں ان کے گھر پر آؤں اور کم از کم اس کا ایک سیریل دیکھوں۔

اس کے مطابق میں ایک روز شام کو ان کے گھر پہنچا۔ ٹی وی کھولا گیا اور ہم دونوں اس کے سامنے بیٹھ کر اس دن آنے والا سیریل دیکھنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ اس میں عجیب وغریب

قسم کے خارق عادت مناظر دکھائے جارہے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کو کھڑا کر کے اس کی کمر کے پاس تلوار ماری جاتی ہے۔ تلوار اس کے جسم کو کاٹتی ہوئی دوسری طرف نکل جاتی ہے مگر اس کا جسم دوبارہ جڑ جاتا ہے اور وہ شخص بدستور زندہ کھڑا رہتا ہے۔

میرے ہندو میزبان جو ایک مغربی ملک سے اعلیٰ سائنسی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے انھوں نے ان عجیب وغریب مناظر کی وضاحت کرتے ہوئے کسی قدر معذرت خواہانہ انداز میں کہا: مولانا صاحب، یہ مائتھالوجی ہے۔ یہ کوئی واقعی تاریخ نہیں۔

کسی سماج کی ذہن سازی یا کردار سازی حقیقی کیریکٹر کے ذریعہ ہوتی ہے نہ کہ افسانوی کیریکٹر کے ذریعہ۔ لوگ کسی افسانوی کہانی کو دلچسپی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں یا اسکرین پر دیکھ کر اس سے وقتی طور پر محظوظ ہو سکتے ہیں۔ مگر اس کا یہ اثر نہیں ہو سکتا کہ اس سے ان کی سوچ بدل جائے یا ان کے عمل میں انقلاب آجائے۔ افسانوی کیریکٹر ایک خیالی کیریکٹر ہوتا ہے اور ایک خیالی کیریکٹر کسی کے لئے عملی سبق کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

رامائن اور مہابھارت کے سیریل محض مائتھالوجی پر مبنی تھے۔ اس کے برعکس مغرب سے آنے والا کلچر ایک حقیقی واقعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ لوگوں کے اوپر مائتھالوجی پر مبنی فلمی کہانی کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ حقیقت پر مبنی مغربی کلچر کی طرف ٹوٹ پڑے۔

ہندستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں میں سائنسی مزاج (scientific tempre) نہیں۔ پنڈت نہرو نے اپنے اس قول میں شاید انہیں لوگوں کی طرف اشارہ کیا تھا جو سائنسی دور میں مائتھالوجی کی بنیاد پر ملک کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ پنڈت نہرو نے درست طور پر یہ سمجھا تھا کہ اس قسم کی کوشش ہمارے ملک کو صرف پیچھے کی طرف لے جائے گی وہ آگے کی طرف لے جانے والی نہیں۔ اس قسم کی کوشش گویا ایک خلاف زمانہ حرکت (anachronism) ہے۔ اور خلاف زمانہ حرکت کبھی کسی کو فائدہ نہیں دے سکتی۔ ہمارے ملک میں ایک طبقہ ہے جس کو یہ اصرار ہے کہ تمام اسکولوں میں سرسوتی دیوی کی تصویریں لگائی جائیں

اور سرسوتی کی وندنا کی جائے۔ ان کا خیال ہے کہ سرسوتی کو چونکہ علم کی دیوی مانا جاتا ہے اس لئے ایسا کرنے سے اسکولوں اور کالجوں میں علم کو فروغ حاصل ہوگا۔ مگر یہ سراسر خوش فہمی ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۵۰ سال سے بھی زیادہ مدت سے سرسوتی دیوی کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے مگر ابھی تک ملک میں علمی ذوق یا سائنسی ذہن پیدا نہ ہو سکا۔ کوئی حقیقی ذوق صرف حقیقی کردار کے ذریعہ پیدا ہو سکتا ہے نہ کہ افسانوی کردار کے ذریعہ۔

اسی طرح اس طبقہ کے ہندوؤں نے سوچا کہ اگر اجودھیا میں بابری مسجد کو ڈھا کر وہاں رام مندر بنادیا جائے تو ملک میں ایک انقلاب آجائے گا۔ ملک کی تاریخ صحیح رخ پر سفر کرنے لگے گی۔ مگر یہ بھی محض ایک خوش فہمی ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

اجودھیا میں بابری مسجد کا بننا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ ثابت شدہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ مغل بادشاہ بابر (وفات ۱۵۳۰) کے گورنر میر باقی نے ۱۵۲۸ میں اجودھیا کی یہ مسجد تعمیر کی۔ چونکہ وہ بابر کے زمانہ میں بنی تھی اس لئے وہ بابری مسجد کے نام سے مشہور ہو گئی۔ اس کے مقابلہ میں رام مسلمہ طور پر ایک افسانوی شخصیت ہیں۔ وہ کوئی تاریخی شخص (historical figure) نہیں۔ جب رام خود کوئی تاریخی شخصیت نہیں تو ان کی جنم بھومی بھی یقینی طور پر ایک غیر تاریخی قصہ ہے۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو یہ واقعہ ہوا کہ مذکورہ ذہن رکھنے والے لوگوں نے بابری مسجد کو ڈھا کر وہاں رام مندر کے نام پر ایک مندر بنادیا۔ خالص علمی طور پر دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو ہندستان کی تاریخ کا وہ بد قسمت دن تھا جب کہ ایک افسانوی دلیل کے ذریعہ ایک تاریخی حقیقت کو رد کر دیا گیا۔

جن لوگوں نے ایسا کیا وہ اس کو تاریخ کی تصحیح کا نام دیتے ہیں مگر زیادہ درست طور پر وہ تاریخ کا قتل تھا۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بظاہر پتھر کا ایک ڈھانچہ ڈھایا گیا مگر حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو اس دن تاریخی مزاج اور سائنسی ذہن کو ڈھادیا گیا۔ اور کسی ملک کے لئے یقینی طور پر اس سے زیادہ تباہ کن بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کے عوام کے اندر سے تاریخی ذوق کا خاتمہ کر دیا جائے۔

اس معاملہ کا ایک اور پہلو ہے۔ یہ دوسرا پہلو مذکورہ پہلو سے کم اہم نہیں بلکہ اپنے نتائج کے اعتبار سے وہ غالباً مذکورہ پہلو سے بھی زیادہ سنگین ہے۔

ہندستان کا دستور مکمل طور پر ایک سیکولر دستور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کی نیشنل لائف کو مذہب سے الگ رکھا جائے گا۔ نیشنل سرگرمیوں کو سیکولر بنیادوں پر قائم کیا جائے گا۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو مذہب کے معاملہ میں ہر شخص یا گروہ کو آزادی ہوگی کہ وہ اپنے نجی دائرہ میں جس مذہب پر چاہے عمل کرے۔ ملک کے ابتدائی معماروں کا یہ فیصلہ نہایت درست تھا کہ ملک کے اجتماعی نظام کو سیکولر بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ موجودہ حالات میں ہندستان کے لئے سیکولر نظام سے بہتر کوئی نظام نہیں ہو سکتا۔

مگر یہ دستور ہند کی اسپرٹ کے سراسر خلاف ہوگا کہ اقلیتوں کے مذہب کو تو ملک کی اجتماعی زندگی سے خارج کر دیا جائے لیکن اکثریتی فرقہ کے مذہب کو کسی ایک یا دوسرے نام پر اجتماعی زندگی میں شامل رکھا جائے۔ اس قسم کی دہری روش ملک میں منافقانہ فضا پیدا کرے گی اور قانون کے احترام کا مزاج یکسر ختم کر دے گی۔ قومی زندگی کو صالح بنیاد پر قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دستور اور قانون میں جو طے کیا جائے اس پر جیسا ہے ویسا (as it is) عمل کیا جائے۔

ایک طرف سیکولرزم اور مساویانہ حقوق کا نام لینا اور دوسری طرف کسی ایک فرقہ کے مذہب کو نیا نام دے کر اس کو دوسرے فرقوں پر مسلط کرنا دو عملی کی روش ہے اور اس قسم کی روش پورے ملک میں لاقانونیت (lawlessness) کی ذہنیت پیدا کر دے گی۔ ایسے حالات میں یہ ناممکن ہو جائے گا کہ ملک میں کوئی تعمیری معاشرہ قائم کیا جا سکے۔

ملک کے تمام سنجیدہ لوگ یہ مانتے ہیں کہ اس وقت ہماری سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ یہاں اقدار پر مبنی سماج (value based society) قائم ہو۔ اس قسم کے سماج کو بنانے کی پہلی شرط یہ ہے کہ ملک کے بااختیار لوگوں میں امانت داری (honesty) پائی جاتی ہو۔ دستور میں لفظی طور پر ایک بات لکھنا اور عملی زندگی میں بلا اعلان کسی اور بات کو رائج کرنا ایک کھلی ہوئی بددیانتی (dishonesty) ہے۔ جس سماج کے بااختیار طبقے میں بددیانتی کا مزاج ہو وہاں کبھی بھی اقدار پر مبنی سماج قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اور جو سماج اخلاقی اقدار (moral values) سے خالی ہو وہ یقینی طور پر ہر دوسری بھلائی سے بھی خالی ہوگا۔

سفر بے منزل

یکم جنوری ۲۰۰۰ کو دنیا کے تمام ملک اکیسویں صدی میں داخل ہو جائیں گے۔ تاہم یہ داخلہ ہر ملک کے لئے یکساں نہ ہوگا۔ کچھ ملکوں کے لئے اکیسویں صدی میں داخلہ ترقیاتی دور میں داخلہ کے ہم معنی ہوگا۔ اور کچھ ملک وہ ہوں گے جن کے لئے یہ داخلہ صرف کیلنڈر بدلنے کے ہم معنی ہوگا۔ کاغذی اعتبار سے وہ اپنے یہاں اکیسویں صدی کی گنتی لکھیں گے مگر حقیقت کے اعتبار سے ابھی وہ صرف بیسویں صدی میں ہوں گے یا اس سے بھی پیچھے۔

بد قسمتی سے ہندستان ان ملکوں میں شامل ہوگا جو صرف کیلنڈر کے معنوں میں اکیسویں صدی میں داخل ہوں گے۔ ترقیاتی معیار کے اعتبار سے وہ اکیسویں صدی کے معیار سے بہت پیچھے ہوں گے۔ ۵۰ سال پہلے ہندستان میں جو بڑے بڑے لیڈر ابھرے انھوں نے کہا تھا کہ ہماری جدو جہد کا نشانہ ہر ہندستانی کی آنکھ کے آنسو پوچھنا ہے۔ مگر پر شور ہنگاموں کے باوجود آج ہم دیکھتے ہیں کہ نتیجہ بالکل برعکس نکلا، رونے والی آنکھوں میں اتنا زیادہ اضافہ ہو گیا ہے کہ اب ایسی آنکھ کو ڈھونڈنا مشکل ہے جو رونے سے بچی ہوئی ہو۔

اس بھیانک ناکامی کا راز کیا ہے۔ اس کا راز ایک لفظ میں صحیح سمت میں سفر نہ کرنا ہے۔ پچھلے طویل دور میں ہمارے لیڈر تعمیر و ترقی کے نام پر پُر شور ہنگامے کرتے رہے۔ مگر شاید وہ حرکت (motion) اور سمت (direction) کا فرق نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے خوبصورت ناموں سے کچھ سرگرمیاں جاری کر کے یہ سمجھ لیا کہ وہ اپنی منزل مقصود کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ حالانکہ منزل کی طرف سفر صرف وہ ہے جو منزل کی سمت میں ہو۔ صحیح رخ کے بغیر حرکت وقت اور طاقت کا ضائع کرنا ہے نہ کہ منزل کی طرف سفر کرنا۔

اب آخری وقت آگیا ہے کہ عمل کی صحیح سمت کا تعین کر کے صحیح رخ پر اپنی کوششوں کو

جاری کیا جائے۔ اس کے بغیر کوئی کوشش نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔

ہندستان کا سفر

ایک مسافر دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر ہے۔ اس کو کلکتہ جانا ہے۔ وہ پلیٹ فارم پر ایک گاڑی دیکھتا ہے اور وہ بلا تحقیق اس پر بیٹھ جاتا ہے۔ ٹرین روانہ ہوتی ہے۔ مسافر خوش ہے کہ وہ اپنی منزل کی طرف جارہا ہے۔ مگر جب ٹرین اپنے آخری اسٹیشن پر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ امرتسر کی طرف جانے والی ٹرین تھی نہ کہ کلکتہ کی طرف جانے والی ٹرین۔ اب مسافر پھر یہی کرتا ہے کہ وہ ضروری تحقیق کے بغیر ایک اور ٹرین پر بیٹھ جاتا ہے۔ مگر دوبارہ یہی ہوتا ہے کہ وہ ایک اور غیر مطلوب منزل پر پہنچ جاتا ہے کیوں کہ یہ ٹرین بمبئی کی طرف جارہی تھی نہ کہ کلکتہ کی طرف۔

اس قسم کا سفر بظاہر سفر دکھائی دیتا ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ سفر بے منزل ہوتا ہے۔ جو مسافر اس طرح سفر کرے وہ کبھی اپنی منزل پر نہیں پہنچے گا، خواہ وہ اپنی ساری عمر ٹرینوں میں گزارتا رہے۔

بدقسمتی سے ہندستان میں یہی صورت پیش آئی ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہندستان آزاد ہوا۔ اب ہم اس پوزیشن میں ہوگئے کہ ہم خود اپنے فیصلہ کے تحت ہندستان کی اعلیٰ تعمیر کر سکیں۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے لیڈر قوم کو غلط ٹرینوں پر بٹھاتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچاس سال سے زیادہ مدت تک سفر کرنے کے باوجود ہندستان اپنی مطلوب منزل تک نہ پہنچ سکا۔

آزادی کے بعد ہمارے لیڈروں نے قوم کو جس ٹرین پر بٹھایا اس کو ایک لفظ میں سوشلسٹ اکسپریس کہا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے ملک کے پورے اقتصادی اور سماجی ڈھانچہ کو بدل دیا گیا۔ ملک کی تمام سرگرمیاں حکومتی عہدہ داروں کے کنٹرول میں دے دی گئیں۔

انگریزوں نے اپنی دو سو سالہ حکومت کے درمیان صرف پانچ سو قانون بنائے تھے۔ مگر

ملکی حکمرانوں نے چالیس سال کے اندر پانچ ہزار سے زیادہ قانون بناڈالے۔ اس کے نتیجہ میں ملک میں وہ چیز قائم ہو گئی جس کو راج گوپال آچاری نے لائسنس پرمٹ راج کہا تھا۔

اس نئے نظام کے تحت ہماری آزادی ایک نئی اور شدید تر پابندی میں تبدیل ہو گئی۔ کسی کو ایک کارخانہ لگانا ہے تو ضروری ہو گیا کہ وہ پچاس سرکاری کھڑکیوں پر کھڑا ہو اور کلیرنس کے لئے برسوں اس دفتر سے اس دفتر تک دوڑتا رہے۔ نام نہاد لیبر قوانین کا نتیجہ یہ ہوا کہ، جے آر ڈی ٹاٹا کے الفاظ میں، ایک صنعت کار اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے مگر وہ اپنے ایک ورکر کو نکال نہیں سکتا۔

اس نام نہاد سوشلسٹ نظام کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی اقتصادی سرگرمیوں سے کامپٹیشن ختم ہو گیا۔ ملک کے بازار غیر معیاری سامانوں سے بھر گئے۔ سرکاری اہل کاروں کے بڑھے ہوئے اختیارات کی بنا پر کرپشن اتنا بڑھا کہ کوئی بھی چھوٹا یا بڑا کام رشوت کے بغیر انجام پانا ناممکن ہو گیا۔ نام نہاد نیشنلائزیشن کے نتیجہ میں سرکاری ملازموں کی ایک عظیم فوج تیار ہو گئی جس کو یہ یقین تھا کہ وہ کام کرے یا نہ کرے مہینہ کے آخر میں بہر حال اس کو تنخواہ مل جائے گی۔ اس مصنوعی نظام نے، ایک سینئر صحافی کے الفاظ میں، پوری ہندستانی قوم کو کاہل (lethargic) بنادیا، وغیرہ وغیرہ۔

آزادی کے بعد ہمارے لیڈروں نے قوم کو سوشلسٹ اکسپریس پر سوار کیا تھا۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ملک تیزی سے اعلیٰ ترقی کی طرف جارہا ہے۔ مگر چالیس سال کے بعد جب اس سفر کی منزل آئی تو یہ حالت ہوئی کہ ملک انگریزی دور سے بھی زیادہ برے حال میں مبتلا ہو چکا تھا۔ ہندستان اپنی آبادی اور اپنے رقبہ کے اعتبار سے دنیا کا تیسرا ملک ہے۔ مگر ترقی کے جدید معیار کے مطابق آج وہ دنیا کا ۱۳۸واں ملک شمار کیا جاتا ہے۔ جب کہ اسی مدت میں سنگاپور اور جنوبی کوریا جیسے چھوٹے چھوٹے ملک ہم سے بہت زیادہ آگے جا چکے ہیں۔

سوشلسٹ اکسپریس پر سفر کرنے کے بعد ہمارے لیڈروں کو محسوس ہوا کہ وہ غلط ٹرین پر بیٹھ گئے تھے۔ اب ملک میں ایک نئی لیڈر شپ زور پکڑنے لگی ہے۔ عرف عام کے مطابق اس نئی لیڈر شپ کو ہندتو لیڈر شپ کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے زور و شور کے ساتھ یہ کہنا شروع کیا کہ

آزادی کے بعد جن لیڈروں کے ہاتھ میں ملک کی قسمت آئی انھوں نے قوم کو غلط ٹرین پر بٹھادیا ۔ ہم کو ووٹ دو تاکہ ہم صحیح ٹرین کے ذریعہ تمہارے ترقیاتی سفر کو جاری کر سکیں۔ ان کے رتھ اندولن سے بہت سے لوگ متاثر ہوگئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۸ کے آغاز میں انھیں یہ موقع ملا کہ وہ ملک کی سیاسی قیادت پر قبضہ کرلیں۔

ان نئے لیڈروں نے ہندستان کو جس نئی ٹرین پر سوار کیا اس کو ایک لفظ میں ہندتو اکسپریس کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے بڑے بڑے دعووں کے ساتھ قوم کو ہندتوا کسپریس پر بٹھایا اور اس کو فل اسپیڈ کے ساتھ چلادیا۔ مگر صرف ایک سال کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ ہندتو اکسپریس کا سفر اس سے بھی زیادہ تباہ کن ہے جتنا کہ سوشلسٹ اکسپرس کا سفر ثابت ہوا تھا۔ سوشلسٹ اکسپریس کے سفر نے ملک کو اقتصادی اعتبار سے تباہ کیا تھا۔ ہندتو اکسپریس کے سفر میں مزید نقصان یہ ہوا کہ اعلیٰ انسانی قدریں (human values) بھی تباہ ہو کر رہ گئیں۔

یہ ہندتو لیڈرشپ راہ روپشت بہ منزل کی ایک مثال ہے۔ وہ آگے کی طرف سفر کے نام پر قوم کو پیچھے کی طرف دوڑانا چاہتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اقبال احمد سہیل مرحوم نے کہا تھا:

آگے ہے قدم پیچھے ہے نظر جانا ہے کہاں جاتے ہیں کدھر
مبہم ہے یہاں خود سمت سفر نیرنگ زمانہ کیا کہیے

ہندتو لیڈرشپ کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ وہ اس کمزوری کی شکار ہے جس کو انگریزی میں کنڈیشنڈ تھنکنگ کہا جاتا ہے، یعنی لگے بندھے ذہن کے تحت سوچنا۔ تقریباً سو سال پہلے شری گرو گول والکر اور ڈاکٹر ہیڈ گواڑ جیسے ماضی پرست لوگوں نے اپنے محدود ذہن کے تحت انھیں جو سبق دیا تھا وہی ان کو معلوم ہے۔ ان کی سوچ بس اسی کے دائرہ میں چلتی ہے۔ ایسے لوگ صرف یہی کرسکتے ہیں کہ ترقی کے نام پر وہ ملک کو پیچھے دھکیل دیں۔ بدقسمتی سے انھوں نے اپنے محدود اقتدار کے زمانہ میں یہی کارنامہ انجام دیا ہے۔

نام نہاد ہند توا ایجنڈا کیا ہے، وہ ملک کو ماضی کے اندھیرے میں دھکیلنے کا دوسرا نام ہے۔ وہ مفروضات یا توہمات کے ذریعہ ملک کے ان مسائل کو حل کرنا ہے جن کے لئے سائنٹفک سوچ اور حقیقت پسندانہ جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر یہ ہند توا لیڈر شپ عجیب وغریب طور پر یہ سمجھتی ہے کہ اسکول کے بچے اگر وندے ماترم جیسے گیت روزانہ صبح کو گائیں یا ریڈیو اور ٹی وی پر ایک پیشہ ور گلوکار اس کو گا کر سنائے تو ملک میں نیشنل اسپرٹ پیدا ہو جائے گی۔ حالانکہ یہ تصور خوش فہمی کی حد تک بے بنیاد ہے۔ صرف یہ حقیقت اس مفروضہ کی تردید کے لئے کافی ہے کہ پچھلی نصف صدی سے یہ گانے اتنی زیادہ بار گائے گئے ہیں کہ شاید ملک کا کوئی بھی شخص نہیں جس کے کانوں تک یہ آواز نہ پہنچی ہو۔ اس کے باوجود نیشنل اسپرٹ کے اعتبار سے ہماری قوم دیوالیہ پن کی حد تک خالی ہو چکی ہے۔ وندے ماترم گانے والوں سے لے کر اس گیت کو سننے والوں تک تقریباً ہر ایک کی آج یہ حالت ہے کہ ذاتی مفاد اور ملک کے مفاد میں ٹکراؤ ہو تو وہ بلا تکلف ذاتی مفاد کی خاطر ملک کے مفاد کو نظر انداز کر دے گا۔ دیش بھکتی کے ان گیتوں نے عملاً قوم کو صرف خویش بھکت بنایا ہے۔ نہ کہ دیش بھکت۔

حقیقت یہ ہے کہ گیتوں اور بھاشڑوں کے ذریعہ کبھی کسی قوم میں دیش بھکتی یا نیشنل اسپرٹ پیدا نہیں ہوتی۔ اس معاملہ میں عربی کا یہ مثل صادق آتا ہے کہ: الناس علی دین ملوکھم۔ یعنی لیڈر لوگ جو روش اپناتے ہیں اسی روش کو عوام بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ ہمارے تقریباً تمام لیڈر کرپشن کلچر کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ ناممکن ہے کہ عوام محض گیتوں کی بنیاد پر اس کے علاوہ کسی اور کلچر کو اپنائیں۔ اس معاملہ میں سب سے پہلے خود مسٹر لیڈر کو حقیقی معنوں میں مسٹر کلین بننا پڑے گا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ملک میں صحت مند روایات قائم ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ صاف ستھرا ایڈمنسٹریشن ہی صاف ستھرا سماج بناتا ہے۔ جو لیڈر خود بھرشٹاچار میں ڈوبے ہوئے ہوں وہ بھرشٹاچار سے آزاد سماج کبھی نہیں بنا سکتے۔

اسی طرح ہند توا لیڈر شپ کے ایجنڈے میں اور جو چیزیں ہیں، وہ بھی ملکی تعمیر کے اصل

مسئلہ سے غیر متعلق ہیں، انگریزی کی جگہ ہندی اور سنسکرت لانا، مسجد توڑنا اور مندر بنانا، دستور کی سیکولر دفعات کو ختم کرنا، علیحدہ پرسنل لا کی جگہ یکساں سول کوڈ نافذ کرنا، ہندستانیوں کے لئے انڈین کے بجائے ہندو کا لفظ رائج کرنا، وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی تمام باتیں صرف کٹر پن کی علامتیں ہیں۔ ان کا کوئی بھی تعلق ملک کے وسیع تر قومی مفاد سے نہیں۔

ہندتوا ایجنڈا کے علم بردار ایک بے حد اہم حقیقت سے ناواقف ہیں، وہ یہ کہ ہندتو ایجنڈے کے راستہ کی رکاوٹ ملک کا کوئی فرقہ یا گروہ نہیں ہے۔ بلکہ اس ایجنڈے کا اصل مخالف وقت کا عالمی سیلاب ہے۔ آج پوری کی پوری دنیا ہندتو سے مختلف ایک اور سماج کی طرف جارہی ہے۔ اس نئے عالمی سماج میں ہندتو کا کوئی مقام نہیں۔ حتی کہ اگر نئے عالمی افکار کے نئے سیلاب کو نظر انداز کر کے اپنے ملک میں ایک علیحدہ جزیرہ بنانا چاہیں تو گلوبل ولیج کے اس دور میں وہ کبھی بننے والا نہیں۔ ایسی کوئی کوشش ایک چلتے ہوئے ہاتھی کی دم میں پتنگ باندھنے کے ہم معنی ہے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ایسی پتنگ کبھی ہاتھی کی دم میں نہیں بندھتی بلکہ وہ ہوا میں اڑ کر رہ جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ سوشلسٹ اکسپریس یا ہندتوا کسپریس دونوں میں سے کوئی بھی ملک کو اس کی منزل پر پہنچانے والی نہیں۔ ہم کو ہماری منزل مقصود تک جو ٹرین پہنچائے گی وہ صرف تعمیر اکسپریس ہے نہ کہ کوئی اور اکسپریس۔

تعمیر اکسپریس سے میری مراد یہ ہے کہ ملک میں تعلیم کو عام کیا جائے۔ فرقہ وارانہ نفرت کی باتیں ختم کی جائیں۔ سیاست میں ووٹ بینک بنانے کی پالیسی کو ترک کیا جائے۔ سرکاری دفتروں سے بھرشٹاچار کا خاتمہ ہو۔ حکومت اپنی پوری طاقت کو استعمال کر کے ملک میں بہترین انفراسٹرکچر وجود میں لائے۔ مذہب کو سیاست سے الگ رکھ کر لوگوں کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے دائرہ میں جس مذہب کو چاہیں اختیار کریں، اور قومی پالیسی کو تمام تر سیکولرزم یا عمومی مفاد کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔ دنیا کے جس ملک نے بھی ترقی کی ہے، اس نے اسی تعمیری منصوبہ کو اختیار کر کے ترقی کی ہے۔ ہندستان کو ایک ترقی یافتہ ملک بنانے کے لئے بھی اس کے سوا کوئی اور دوسرا طریقہ نہیں۔

تعمیرِ ہند

ہندستان اپنے رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے دنیا کے ملکوں میں تیسرا سب سے بڑا ملک ہے۔ لیکن ترقی کے جدید معیار کے اعتبار سے وہ دنیا کے ملکوں میں ۱۳۸ ویں نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔ شہری سہولتوں کے اعتبار سے وہ دبئی اور سنگاپور جیسے انتہائی چھوٹے ملکوں سے بھی بہت پیچھے ہے۔ ہندستان کا یہ حال اس وقت ہے جب کہ اس کی آزادی پر ۵۰ سال سے بھی زیادہ مدت گزر چکی ہے۔

اس صورت حال کے بے شمار نقصانات ہیں۔ انھیں میں سے ایک بہت بڑا نقصان یہ ہے کہ ملک کے بہترین دماغ بڑی تعداد میں باہر چلے جا رہے ہیں۔ ہر نوجوان یہ چاہنے لگا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح باہر کے ترقی یافتہ ملکوں میں پہنچ جائے کیوں کہ ہندستان میں رہ کر وہ ان ترقیاتی سہولتوں کو حاصل نہیں کر پاتا جو دور جدید کے ایک ترقی یافتہ ملک کے شہریوں کو حاصل ہیں۔

ترقی کی دوڑ میں ہندستان اس قدر پیچھے کیوں ہے۔ غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہندستان میں ابھی تک وہ چیز نہ آسکی جس کو جواہر لال نہرو نے نیشنل انٹگریشن کا نام دیا تھا۔ یعنی ملک کے مختلف گروہوں کے درمیان وہ اتحاد جو اس بات کو ممکن بناتا ہے کہ مختلف گروہ یکجہتی کے ساتھ مل کر کام کریں۔

ہندستان کے مختلف گروہوں میں سے دو گروہ سب سے بڑے ہیں۔ ہندو اور مسلمان۔ انھیں دونوں گروہوں کے اتحاد پر ملک کے مجموعی اتحاد کا انحصار ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد ہو تو گویا کہ سارا ملک متحد ہو گیا۔ اور اگر ان دو بڑے گروہوں میں اتحاد نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک اختلاف و انتشار کا شکار رہے گا اور جو ملک اس طرح داخلی بے اتحادی کا شکار رہے وہ کبھی ترقی کے اعلیٰ درجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی اس اہمیت کو مہاتما گاندھی نے نہایت گہرائی کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ میں جب ملک آزاد ہوا تو انھوں نے اس کو اپنی زندگی کا واحد مشن بنالیا کہ ملک کے دونوں فرقے مل جل کر رہنے لگیں۔ اس وقت انھوں نے اپنے تاریخی الفاظ میں کہا تھا کہ اس ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو امن کے ساتھ اور مل جل کر رہنا ہوگا ورنہ میں اس کوشش میں اپنی جان دے دوں گا۔

Hindus and Musalmans should learn to live together in peace and amity. Otherwise, I should die in the attempt. (P 449)

ہندستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے اسی خاص مقصد کے لئے نیشنل انٹگریشن کونسل بنائی۔ اس کے بعد اس مقصد کے لئے بے شمار کوششیں کی جاتی رہیں جن کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ مگر ۵۰ سال سے بھی زیادہ مدت گزرنے کے باوجود اس مقصد میں ابھی تک شاید ایک فی صد بھی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ہندو مسلم تعلقات کا معاملہ بدستور ایک بعید خواب بنا ہوا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ملک کی مطلوب ترقی بھی۔

کیا وجہ ہے کہ اتنا زیادہ ضروری مقصد لمبی کوشش کے باوجود ابھی تک حاصل نہ کیا جاسکا۔ اس کی وجہ میرے نزدیک صرف ایک ہے، اور وہ ہے ایک ممکن چیز کو ناممکن طریقہ سے حاصل کرنے کی کوشش۔ ہوا سے آکسیجن کا حصول ہر آدمی کے لئے پوری طرح ممکن ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص آکسیجن کو اپنی ناک کے بجائے کان کے ذریعہ لینا چاہے تو یہ انتہائی ممکن چیز بھی اس کے لئے ناممکن ہو جائے گی۔

کوئی سماج، خواہ وہ ایک کلچر کا سماج ہو یا کئی کلچر کا سماج، اس میں ہمیشہ کچھ چیزیں لوگوں کے درمیان مشترک ہوتی ہیں۔ اور کچھ غیر مشترک۔ یہ فطرت کا ایک لازمی تقاضہ ہے۔ سماجی اتحاد دراصل انھیں دونوں تقاضوں کے درمیان ہم آہنگی کا فارمولا تلاش کرنے کا نام ہے۔ اسی فارمولا کے حصول یا عدم حصول پر اس معاملہ کا انحصار ہے۔

۱۹۴۷ سے لے کر اب تک اس رخ پر کی جانے والی کوششوں کی ناکامی کا اصل سبب یہی ہے کہ حقیقی اتحاد کا کوئی فارمولا ابھی تک دریافت نہ کیا جاسکا۔ اور جو فارمولا دریافت کیا گیا وہ سرے سے قابل عمل ہی نہ تھا۔

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا فارمولا وہ ہے جس کی پشت پر مہاتما گاندھی، ڈاکٹر بھگوان داس، ونوبا بھاوے جیسے بڑے بڑے لوگوں کے نام ہیں۔ اس فارمولے کو مختصر الفاظ میں مہاتما گاندھی نے اس طرح بیان کیا تھا ـــــ رام رحیم ایک ہے۔ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ مذہبوں کا الگ الگ ہونا ہی علیحدگی کا ذہن پیدا کرتا ہے۔ اس لئے اگر تمام مذہبوں کو ایک ثابت کر دیا جائے تو یہ اختلاف اپنے آپ مٹ جائے گا۔ اور لوگوں کے اندر وہ جذباتی ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی جو مطلوب ہے۔

مگر یہ نظریہ اصل مسئلہ کا معصومانہ حد تک کمتر اندازہ تھا۔ ان حضرات نے یہ کیا کہ مختلف مذاہب کی چند منتخب تعلیمات کو لے کر یہ سمجھ لیا کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔ مگر مطالعہ کا یہ طریقہ یقینی طور پر غیر سائنٹفک ہے۔ کسی مذہب کے بارے میں کوئی رائے اس کی مجموعی تعلیمات کی روشنی میں قائم کی جائے گی نہ کہ صرف منتخب تعلیمات کی روشنی میں۔ اور جب مجموعی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوازم اور اسلام میں کھلا ہوا اختلاف موجود ہے۔

مثلاً ہندو مذہب میں حقیقت اعلیٰ کے بارے میں وحدت وجود (monism) کا تصور ہے اور اسلام میں توحید (monotheism) کا۔ ہندوازم میں خدا کی تجسیم یا اوتار کا تصور ہے اور اسلام میں خدا کے فرستادہ پیغمبر کا تصور۔ ہندو مذہب میں انسانی زندگی کے بارے میں آواگمن کا تصور ہے اور اسلام میں پہلی ہی موت کے بعد جزا و سزا کا تصور، وغیرہ۔

اعتقادیات کا یہ فرق اتنا زیادہ بنیادی ہے کہ اگر مذکورہ فارمولے کو اتحاد کا وسیلہ سمجھا جائے تو مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان کبھی بھی اتحاد ممکن نہ ہوگا۔ مہاتما گاندھی

اور ان کے جیسے دوسرے لوگوں نے اتحاد کا جو فارمولا وضع کیا اس کو ایک لفظ میں باہمی اعتراف (mutual recognition) کا فارمولا کہا جاسکتا ہے۔ مگر یہ فارمولا حقیقت پر مبنی نہیں، اس لئے وہ قابل عمل بھی نہیں۔

مذہب ایک مقدس عقیدہ کا نام ہے، مذہب میں ترمیم ممکن نہیں ہوتی اس لئے ہمیں مذہب کو جیسا ہے ویسا (as it is) ہی ماننا ہوگا، ہمیں سماجی اتحاد کا ایک ایسا فارمولا دریافت کرنا ہوگا جو مذہبی تبدیلی کے بغیر قابل عمل اور قابل اختیار ہو۔

خوش قسمتی سے یہ قابل عمل فارمولا پیشگی طور پر ہمارے یہاں موجود ہے۔ اس دوسرے فارمولے کو مختصر طور پر باہمی احترام (mutual respect) کا فارمولا کہا جاسکتا ہے۔ جن ترقی یافتہ ملکوں (مثلاً امریکہ اور کناڈا) کے سماج میں اختلافات کے باوجود مذہبی جھگڑے نہیں ہیں وہاں اسی دوسرے فارمولے کو اختیار کر کے ان جھگڑوں کو ختم کیا گیا ہے۔ ان ملکوں میں بھی مختلف مذاہب کے لوگ موجود ہیں۔ مگر وہاں انھوں نے غیر ضروری طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ میرا اور تمہارا مذہب ایک ہے۔ اس کے بجائے انھوں نے انگریزی مثل کے مطابق، اس اصول کو استعمال کیا کہ آؤ، ہم اس پر اتفاق کرلیں کہ ہمارے درمیان اختلاف ہے:

Let us agree to disagree

یہ فارمولا کوئی انوکھا فارمولا نہیں۔ یہ فطرت کے اٹل اصول پر مبنی ہے۔ وسیع تر مطالعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا کے ہر شعبہ میں تعدد کا اصول ہے نہ کہ توحد کا۔ اسی حقیقت کا اعتراف شری گرو گولوالکر نے اپنے ایک انٹرویو میں ان الفاظ میں کیا تھا کہ فطرت یکسانیت سے نفرت کرتی ہے (nature abhors uniformity) سوامی وویکانند نے بھی اس حقیقت کا اعتراف اس طرح کیا کہ انھوں نے کہا کہ مذہبوں کے اختلاف کو مٹانا ممکن نہیں اس لئے تم کو ایسا کرنا چاہئے کہ ــــ ایک کی پیروی کرو اور کسی سے نفرت نہ کرو (follow one,and hate none)

اسی فطری اصول کو اہل مغرب نے اختیار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے درمیان فوراً ہی سماجی اتحاد قائم ہو گیا۔ اور وہ ترقی کی طرف تیزی سے سفر کرنے لگے۔ اگر وہ لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ میرا اور تمہارا مذہب ایک ہے تو اس کے بعد ان کے یہاں جو چیز آتی وہ باہمی اتحاد نہ ہوتا بلکہ باہمی جھگڑا ہوتا۔ اور پھر وہ بھی اسی طرح ایک پس ماندہ ملک بنے رہتے جیسا کہ ہمارا ملک ہندستان ہے۔

اختلاف فطرت کا ایک اٹل اصول ہے۔ اختلافات کو ختم کرنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ اس لئے سماجی اتحاد کا قابل عمل فارمولا صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے ـــــ اختلاف کے باوجود اتحاد۔ جو لوگ اختلاف کو مٹا کر اتحاد قائم کرنا چاہتے ہیں وہ حقیقت سے لڑ رہے ہیں۔ اور حقیقت سے لڑ کر جیتنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔

۲۔ اس سلسلہ میں دوسرا فارمولا وہ ہے جو گرو گولوالکر اور ان کے ہم خیال لوگوں نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان میں مختلف گروہوں کے درمیان اتحاد صرف اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کہ ان کے اندر سچی حب الوطنی (patriotism) پیدا کی جائے۔ بجائے خود یہ بات درست ہے کہ حب الوطنی کا جذبہ کسی ملک کے باشندوں کے لئے اتحاد کا نہایت طاقتور ذریعہ ہے۔ لیکن حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے جو فارمولا گرو گولوالکر اور ان کے جیسے لوگوں نے پیش کیا وہ دوبارہ ایک ناقابل عمل فارمولا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نصف صدی سے زیادہ مدت تک اس کی لفظی دھوم مچانے کے باوجود عملاً وہ کسی بھی درجہ میں کامیاب نہ ہو سکا۔

گرو گولوالکر اور ان کے ہم خیال لوگوں کا کہنا ہے کہ سچا محبّ وطن صرف وہ ہو سکتا ہے جو ملک (بھارت) کو مقدس سمجھے۔ ان کے نزدیک ہندو اس ملک کو مقدس سمجھتے ہیں اس لئے وہی سچے محبّ وطن ہیں۔ مسلمان اپنے عقیدۂ توحید کی بنا پر کسی ملک کو مقدس نہیں سمجھتے اس لئے وہ سچے محبّ وطن نہیں بن سکتے۔ اس مسئلہ کا حل انھوں نے یہ بتایا کہ مسلمانوں کو بھی اسی معنی میں محبّ وطن بنایا جائے جس معنی میں ہندو محبّ وطن ہیں۔ اس کے بغیر ملک میں حب الوطنی کی صحیح

فضا پیدا نہیں ہو سکتی۔

یہ نظریہ سراسر بے بنیاد ہے۔ وہ ایک خود ساختہ مفروضہ پر قائم ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ اپنی ماں سے محبت صرف ہندو کر سکتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی ماں کو ایک مقدس دیوی کے روپ میں دیکھتا ہے۔ مسلمان چونکہ اپنی ماں کو مقدس دیوی نہیں سمجھتا اس لئے وہ ماں سے محبت بھی نہیں کر سکتا۔ یہ بات بلاشبہ غلط ہے۔ اس لئے کہ ماں سے محبت ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کے اندر لازمی طور پر ہوتا ہے، خواہ وہ ایک مذہب کو ماننے والا ہو یا دوسرے مذہب کو ماننے والا۔ ماں سے محبت پیدا کرنے کے لئے اس کی ضرورت نہیں کہ کوئی شخص اس کے بیٹے اور بیٹی کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرے کہ تمہاری ماں ایک مقدس دیوی ہے۔ تم جب تک اس کو مقدس دیوی نہیں مانو گے، تم اس سے محبت بھی نہیں کر سکو گے۔

ٹھیک یہی معاملہ وطن کا ہے۔ وطن سے محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو ہر انسان میں لازمی طور پر ہوتا ہے۔ کسی آدمی کا نظریہ یا مذہب خواہ کچھ بھی ہو، وہ پیدائشی طور پر مجبور ہے کہ جہاں وہ پیدا ہوا اور جہاں وہ پلا بڑھا ہے، اس سے وہ محبت کرے۔ یہ محبت اپنے آپ آدمی کے دل میں ہوتی ہے، اس کے لئے کسی بیرونی کوشش کی ضرورت نہیں۔

دنیا میں تقریباً دو سو ملک پائے جاتے ہیں۔ ہر ملک کے لوگ اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ذاتی انٹرسٹ اور ملکی انٹرسٹ میں ٹکراؤ ہو تو وہ اپنے انٹرسٹ کو پیچھے رکھتے ہیں اور ملکی انٹرسٹ کو آگے۔ حالانکہ ان میں سے کسی بھی ملک کے باشندے اپنے ملک کو دیوی دیوتا کا درجہ نہیں دیتے۔ یہی حب الوطنی کا عالمی اصول ہے۔ ہمیں بھی اسی اصول کو اختیار کرنا چاہئے۔ ہندستان میں ہم حب الوطنی کا کوئی الگ جزیرہ نہیں بنا سکتے۔ اس قسم کی غیر حقیقی کوشش ملک کو تباہ تو کر سکتی ہے مگر ملک کی ترقی میں وہ ہرگز معاون نہیں ہو سکتی۔

۳۔ اسی نظریہ کو کچھ لوگوں نے ایک خوبصورت نام دیا ہے جس کو وہ کلچرل نیشنلزم کہتے

ہیں۔ یہ لوگ ہندستان کے اکثریتی فرقہ کے کلچر کو ملکی کلچر بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ملک کے تمام باشندوں کے لئے ضروری ہے کہ اس کلچر کو اختیار کریں ورنہ ملک میں نیشنل اسپرٹ پیدا نہیں ہو سکے گی۔

یہ نظریہ بھی سراسر غیر علمی اور غیر فطری ہے۔ وہ دنیا میں کہیں بھی رائج نہیں اور نہ ہندستان میں اس کو قائم کیا جاسکتا ہے۔

قومیت یا نیشن ہڈ کا تعلق صرف ہندستان سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق تمام ملکوں سے ہے۔ اس کا ایک متفقہ عالمی نظریہ ہے۔ ہمیں بھی اس معاملہ میں وہی اصول اختیار کرنا ہے جو عالمی سطح پر رائج ہے۔ اس معاملہ میں ہم خود ساختہ طور پر کوئی علیحدہ اصول اختیار نہیں کر سکتے۔

تمام قوموں کے متفقہ اصول کے مطابق، قومیت یا نیشن ہڈ کی بنیاد وطن (motherland) پر ہے۔ اسی اصول پر تمام دوسرے ملکوں میں قومیت کی تشکیل ہوئی ہے۔ ان ملکوں کے باشندوں میں نیشنل اسپرٹ پوری طرح موجود ہے۔ حتی کہ شاید ہندستانیوں سے بہت زیادہ۔ گلوبل ویلج اور اقوام متحدہ کے اس دور میں ہم اپنا کوئی علیحدہ سیاسی گھروندا نہیں بنا سکتے۔ اور اگر بنانے کی کوشش کی گئی تو اس کے لئے پیشگی طور پر مقدر ہے کہ وہ ناکام ہو کر رہ جائے۔ اس نظریہ کے ماننے والوں کی کوشش یہ ہے کہ وہ ملک کے تمام باشندوں کو سرسوتی دیوی کی وندنا کرائیں اور اسکول کے تمام طلبہ کو وندے ماترم کے گیت میں شامل کریں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح اس کلچرل نیشنلزم کو لانے میں مدد ملے گی جس کے بغیر ان کے نزدیک ہندستان میں قومیت کی تشکیل ممکن نہیں۔

یہ بھی بلاشبہ ایک بے بنیاد مفروضہ ہے۔ مثال کے طور پر سرسوتی کو علم کی دیوی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ سرسوتی کی وندنا سے علم اور تعلیم کو فروغ حاصل ہوگا۔ مگر واقعات اس کی کامل تردید کرتے ہیں۔ ہندستان میں سرسوتی کا گیت پچاس سال سے بھی زیادہ مدت سے گایا جارہا ہے۔ مگر یہاں ابھی تک کوئی قابل لحاظ علمی ترقی نہ ہو سکی۔ اس کے برعکس دور جدید کے

وہ ممالک جن کو ترقی یافتہ ممالک کہا جاتا ہے وہاں کے اسکولوں اور تعلیم گاہوں میں کسی علم کی دیوی کا گانا نہیں گایا جاتا۔ پھر بھی وہ ہم سے اتنا زیادہ آگے ہیں کہ ہم شاید ان کے پیچھے بھی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سر سوتی یا وندے ماترم مذہبی عقیدہ کی چیزیں ہیں۔ ان کا دنیوی شعبوں سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی شخص یا گروہ ذاتی عقیدہ کے طور پر ان کو اختیار کر سکتا ہے مگر وسیع تر اجتماعی زندگی میں ان کو داخل کرنا اور تمام لوگوں پر ان کو نافذ کرنے کی کوشش کرنا غیر فطری بھی ہے اور ناممکن بھی۔ اس طرح کی کوشش کا کوئی فائدہ تو نہیں ہوگا، البتہ جھگڑوں میں اضافہ کرکے اصل مطلوب مقصد کا حصول مزید دشوار ہو جائے گا۔

اگر ہم ہندستان کو ایک ترقی یافتہ ملک بنانا چاہتے ہیں تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ مذہبی عقیدہ کو لوگوں کا انفرادی معاملہ قرار دے کر ہر ایک کو اس کی آزادی دے دی جائے۔ اور جہاں تک اجتماعی معاملات کا تعلق ہے اس کو سیکولر بنیاد پر قائم کیا جائے۔ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں نے اسی اصول کو اختیار کرکے ترقی کی ہے۔ ہندستان بھی اسی اصول کی بنیاد پر ترقی کر سکتا ہے۔ اس کے سوا دوسرا کوئی بھی راستہ مفید یا قابل عمل نہیں۔

وندے ماترم، سر سوتی کا گیت یا اس طرح کی اور چیزیں کسی مذہب کے خلاف ہوں یا نہ ہوں مگر یہ یقینی ہے کہ وہ ترقی کے خلاف ہیں۔ وہ مستقبل کی مطلوب تعمیر میں فیصلہ کن رکاوٹ ہیں۔ ہمارے موجودہ لیڈروں کے لئے عقل مندی یہ ہے کہ وہ اس قسم کی چیزوں کو اپنے ذاتی عقیدہ تک محدود رکھیں۔ ان کو ملک کی قومی زندگی یا اجتماعی شعبوں میں داخل کرنے پر اصرار نہ کریں۔ اگر انھوں نے خود سے ایسا نہ کیا تو ملک کی اگلی نسلیں جبراً ان چیزوں کو پیچھے دھکیل دیں گی۔ وہ ان کو چھوڑ کر خالص سیکولر بنیاد پر ملک کی تعمیر کریں گی۔ کیونکہ ترقی اس ملک کے ہر انسان کا سب سے بڑا مطلوب ہے۔ اور ایسی مطلوب چیز کے بارے میں انسان کبھی سمجھوتہ کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔

یہ واقعہ مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں ہو چکا ہے۔ وہاں کا مذہبی طبقہ پہلے اپنے مذہبی رسومات و عقائد کو سیکولر شعبوں سے جوڑے ہوئے تھا۔ اس کے نتیجے میں ان کی ترقی صدیوں تک رُکی رہی یہاں تک کہ وہاں کے عوام نے بغاوت کر کے ان مذہبی زنجیروں کو توڑ دیا۔ اس کے بعد ترقی کی طرف ان کا سفر بے روک ٹوک شروع ہو گیا۔

یہ باغیانہ تحریک ہندستان میں بھی شروع ہو چکی ہے۔ اس کی ایک علامتی مثال یہ ہے کہ ہماری نئی نسل جو اسکولوں اور کالجوں میں پڑھ رہی ہے وہ نمستے یا نمسکار کہنے کے بجائے ہائے اور ہیلو کہنے لگی ہے۔ ایسی حالت میں ہندستانی لیڈروں کو چاہیے کہ وہ اس تبدیلی کو اختیارانہ طور پر قبول کرلیں جس کو انھیں مستقبل میں مجبورانہ طور پر قبول کرنا پڑے گا، کیونکہ عوامی بغاوت کا مقابلہ کرنے کی طاقت کسی کے اندر بھی نہیں۔

آخری بات

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان کی سیاسی آزادی کی جو پرجوش تحریک اٹھی اس کے ساتھ کس قسم کی بڑی بڑی امیدیں شامل تھیں اور کیسے رومانی خیالات کے سایہ میں وہ آگے بڑھ رہی تھی، اس کا اندازہ ایک شعر سے ہوتا ہے۔ ایک شاعرِ انقلاب کا یہ شعر اس زمانہ میں ہر گاؤں اور ہر شہر میں گونج رہا تھا:

آج ہمالہ کی چوٹی سے پھر ہم نے للکارا ہے دور ہٹو اے دنیا والو ہندستان ہمارا ہے

مگر آزادی ملنے کے بعد جلد ہی یہ سارا جوش و خروش جاتا رہا۔ آج ملک کے اہل فکر عام طور پر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہماری ہمالیائی تحریک نے ملک سے بیرونی قوم کے سیاسی غلبہ کو تو ختم کیا مگر اس کے جلد ہی بعد بیرونی قومیں اپنی تہذیبی برتری اور اقتصادی طاقت کی بنا پر دوبارہ ہندستان میں داخل ہو گئیں۔ آج ہر شعبہ میں دوبارہ انھیں کا غلبہ قائم ہو گیا ہے۔ دستوری اعتبار سے ملک کی قومی زبان ہندی ہے مگر عملی طور پر ملک میں جس زبان کا راج ہے وہ ہندی نہیں ہے

بلکہ انگریزی ہے۔

اسی طرح آج ہندستان کے سماج میں مغربی کلچر تیزی سے چھاتا جارہا ہے۔ یہاں کی مارکیٹ پر بیرونی کمپنیاں اپنی برتر حیثیت کے ساتھ داخل ہو گئی ہیں۔ یہاں کا پریس اور یہاں کا میڈیا ان کا خادم بنتا جارہا ہے۔ حتی کہ یہاں کی سیاست بھی بالواسطہ طور پر انھیں کے زیر اثر کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

یہ المناک واقعہ ہندستانی لیڈر شپ کی ایک عظیم کوتاہی کو بتاتا ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہ لوگ ملک کے مسئلہ کو ہندستانی ورسس انگریز (ہندستانی بمقابلہ انگریز) کا مسئلہ سمجھ رہے تھے۔ وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ انگریزوں کے سیاسی اقتدار کا خاتمہ ملک کی عظمت کو قائم کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ مگر اصل حقیقت کے اعتبار سے یہ مسئلہ ہندستان ورسس برٹش راج نہ تھا بلکہ وہ ہندستان ورسس عالمی سیلاب تھا۔ پہلے تصور کے تحت یہ مسئلہ بظاہر طاقت ور ہندستان کے مقابلہ میں کمزور انگریز کا مسئلہ تھا۔ مگر دوسرے پہلو سے یہ مسئلہ کمزور ہندستان بمقابلہ طاقتور عالمی سیلاب بن گیا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ۱۹۴۷ میں نشانہ کے مطابق سیاسی آزادی حاصل کرنے کے باوجود ہندستان بدستور بیرونی طاقتوں کے مقابلہ میں مغلوب بنا ہوا ہے۔

یہی معاملہ اس مسئلہ کا بھی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا۔ قدیم مسئلہ کو ایک لفظ میں آزادی سے تعبیر کیا گیا تھا، اب جدید مسئلہ کو ایک لفظ میں ہندتو سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مگر ہندتو اندولن کی لیڈر شپ دوبارہ وہی غلطی کررہی ہے جو آزادی اندولن کی لیڈر شپ نے کی تھی۔

ہماری قدیم لیڈر شپ نے معاملہ کو دو ایسے فریقوں کے درمیان کا معاملہ فرض کرلیا تھا جس میں وہ بظاہر طاقتور دکھائی دے رہے تھے۔ اور فریق ثانی کمزور نظر آتا تھا جب کہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اسی طرح ہندتو لیڈر شپ اپنے معاملہ کو ہندو ورسس مسلم معاملہ سمجھ رہی ہے۔ اس تقسیم میں اس کو یہ سارا معاملہ اکثریتی فرقہ اور اقلیتی فرقہ کے درمیان کا معاملہ نظر آتا ہے۔

اس تقسیم کے تحت وہ سمجھتے ہیں کہ ہم طاقتور پوزیشن میں ہیں اور ہماری کامیابی یقینی ہے۔ مگر اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ دوبارہ ہندستان ورسس عالمی زمانی سیلاب کا ہے۔ یعنی یہ ہندستان کے قدیم کلچر اور جدید سائنٹفک کلچر کے درمیان کا معاملہ ہے۔ اس معاملہ میں یقینی طور پر ہندتو اندولن فریق ثانی کے مقابلہ میں بیحد کمزور ہے۔ اس معاملہ میں عالمی دھارے کی حیثیت اگر سیلاب کی ہے تو ہندتو دھارے کی حیثیت محض ایک تنکے کی۔ یہ یقینی ہے کہ اس جدید مقابلہ میں ہندتو لیڈر شپ اس سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوگی جتنا کہ قدیم مقابلہ میں آزادی کی لیڈر شپ ثابت ہوئی تھی۔

یہ تاریخ کا فیصلہ ہے، اور تاریخ کے فیصلہ کو بدلنا کسی بھی شخص کے لئے ممکن نہیں، خواہ وہ کوئی لیڈر ہو یا کوئی حکومت۔

Size 22x14.5cm, 152 pages

Size 22x14.5cm, 128 pages

Size 22x14.5cm, 176 pages

Size 22x14.5cm, 72 pages

Size 22x14.5cm, 160 pages

Size 22x14.5cm, 264 pages

Size 22x14.5cm, 116 pages

Size 22x14.5cm, 224 pages

پیغام عمل

آزادی کے بعد ہندستان میں جو نئے مسائل پیدا ہوئے ان میں سے غالباً سب سے زیادہ سنگین مسئلہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وہ انٹرایکشن (ملنا جلنا) تقریباً ختم ہو گیا جو آزادی سے پہلے کے دور میں بڑے پیمانے پر جاری تھا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ ملک کے دونوں بڑے فرقے ان مواقع سے محروم ہو گئے جب دونوں کے درمیان نارمل فضا میں اختلاط ہو اور دونوں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نئے ہندستان کی فضا میں تعمیر کے لئے متحدہ کوشش کر سکیں۔ یہ بلاشبہ بے حد سنگین واقعہ تھا اور اس کے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔

آزادی کے بعد ملک میں ایک نئی بات یہ ہوئی کہ ہندوؤں کے وہ انتہاپسند طبقے ابھر آئے جو اس سے پہلے بڑی حد تک دبے ہوئے تھے۔ یہ واقعہ ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں فیصلہ کن رکاوٹ بن گیا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے دھارے ایک دوسرے سے بڑی حد تک الگ ہو گئے۔ اس کا نقصان بیک وقت دونوں فرقوں کو پہنچا، ہندوؤں کو بھی اور مسلمانوں کو بھی۔

نئے ہندستان میں جب مسلمانوں کا معاملہ ہندوؤں سے پیش آیا تو انھوں نے محسوس کیا کہ یہاں دو قسم کے ہندو پائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی نسبت سے ان دونوں قسم کے ہندوؤں کو الگ الگ نام دیا جائے تو وہ یہ ہوگا۔۔۔ نو پرابلم ہندو (بے مسئلہ ہندو) اور پرابلم ہندو (بامسئلہ ہندو) مسلمانوں نے محسوس کیا کو نو پرابلم ہندوؤں سے تو وہ باآسانی ملنے جلنے کا سلسلہ قائم رکھ سکتے ہیں، مگر پرابلم ہندو سے بظاہر اس قسم کا سلسلہ قائم رکھنا موجودہ حالت میں سخت مشکل ہے۔

آزادی کے بعد مسلمانوں کے درمیان جو قیادت ابھری اس نے اس مسئلہ کا حل یہ سمجھا کہ نو پرابلم ہندوؤں سے تعلقات بڑھائے جائیں اور ان کو لے کر پرابلم ہندوؤں کا مقابلہ کیا جائے۔ اس نظریہ کے تحت مسلمانوں میں کئی قیادتیں ابھریں اور کئی تحریکیں اور تنظیمیں برپا ہوئیں۔ ان

شخصیتوں اور تحریکوں کے پر شور عمل کا سلسلہ تقریباً چالیس سال تک جاری رہا۔ مگر نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ بیسویں صدی کے آخر میں پہنچ کر پرابلم ہندوؤں نے ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں سو گنا زیادہ طاقت حاصل کرلی۔ وہ ملک کے اکثر اجتماعی اداروں میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے مرکزی اور ریاستی سطح پر اپنی حکومت بنالی، وغیرہ۔

نو پرابلم ہندوؤں کو لے کر پرابلم ہندوؤں کا مقابلہ کرنا، ایک غیر فطری اور غیر حکیمانہ نظریہ تھا۔ یہ ایک منفی نقطہ نظر ہے، اور منفی نقطہ نظر کے تحت کی ہوئی کوئی بھی کوشش کبھی مثبت نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ مثبت نتیجہ ہمیشہ مثبت جدوجہد کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے نہ کہ منفی جدوجہد کے ذریعہ۔

اس نقطۂ نظر کا مزید نقصان یہ ہوا کہ ہندستان کے مسلمان عملاً اس ملک میں ایک احتجاجی گروہ بن کر رہ گئے۔ مذکورہ نقطہ نظر عین اپنی فطرت کے مطابق، احتجاج اور شکایت کا ذہن پیدا کرتا ہے۔ اور یہی مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ ان کا ہر اخبار ایک احتجاج نامہ بن گیا۔ ان کے جلسے احتجاجی جلسوں میں تبدیل ہو گئے۔ ان کے درمیان ایسے لوگ قائد بن کر ابھرنے لگے جو اپنے پر شور الفاظ کے ذریعہ مسلمانوں کی احتجاجی نفسیات کو تسکین دے سکتے تھے۔

احتجاج یا شکایت، دل کی بھڑاس نکالنے کا دوسرا نام ہے۔ نئے ہندستان میں یہاں کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالیں، وہ اپنے اندر پائے جانے والے غم وغصہ کے لئے ایک لفظی نکاس (outlet) پالیں۔ اس ملک میں مسلمانوں کو ایک تخلیقی کردار (creative role) ادا کرنا تھا۔ اور ملک کی قسمت بنانے میں اپنا وہ تاریخی حصہ ادا کرنا تھا جو قانون فطرت کے تحت کسی زندہ اقلیت کے لئے مقدر رہے۔

انگریز مورخ آرنلڈ ٹوائن بی نے اپنی کتاب (اسٹڈی آف ہسٹری) میں اقلیتوں کے اس رول کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہی بات قرآن میں اس طرح بتائی گئی ہے۔۔۔ کتنی ہی

چھوٹی جماعتیں اللہ کے اذن سے بڑی جماعتوں پر فائق ثابت ہوئی ہیں۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (البقرہ ۲۴۹)

اس آیت میں اذن سے مراد قانون فطرت ہے جو اللہ نے اپنی حکمت کے تحت اس دنیا میں قائم فرمایا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ جب بھی کوئی اقلیتی گروہ کا مقابلہ کسی اکثریتی گروہ سے پیش آتا ہے تو اس کے بعد لازماً ایسا ہوتا ہے کہ اقلیتی گروہ کے اندر وہ اعلیٰ صفت پیدا ہوتی ہے جس کے مجموعہ کا نام قرآنی اصطلاح میں صبر ہے۔ یعنی چیلنج کا فائق تر سطح پر جواب دینے کا جذبہ پیدا ہونا۔ اس طرح چیلنج اور رسپانس کا میکانزم اقلیتی گروہ کے اندر نئی اور تخلیقی صفات پیدا کرتا ہے۔ وہ مسائل کا برتر حل دریافت کرتا ہے۔ یہ عمل جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اقلیت خود بھی کامیاب ہوتی ہے اور پورے سماج کے لئے بھی زندگی کا نیا تحفہ دینے کا سبب بن جاتی ہے۔

پیش آمدہ مسائل کا جواب اگر منفی انداز میں دیا جائے تو اسی کا نام بے صبری ہے۔ اور اگر پیش آمدہ مسائل کا جواب مثبت انداز میں دیا جائے تو اسی کو قرآن کی اصطلاح میں صبر کہا گیا ہے۔ منفی عمل کا مثبت جواب دینا، یہی تخلیقیت کا اہم ترین عنصر ہے۔ اور یہی وہ خاص صفت ہے جو کسی اقلیتی گروہ کو اکثریتی گروہ سے بھی زیادہ بڑا کردار ادا کرنے کے قابل بنا دیتی ہے۔

اب پہلا سوال یہ ہے کہ اس ملک کے مسلمان اس تاریخی کردار کو ادا کرنے کے لئے کیا کریں جو ان کے لئے فطرت کے قانون کے تحت مقدر ہے۔ اس سلسلہ کا پہلا اور ضروری کام وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ یعنی مسلمان اپنی احتجاجی سیاست کو ختم کر دیں اور اس کے بجائے مثبت تعمیری سیاست کا طریقہ اختیار کریں۔

ہندستان کے مسلمان اس وقت جس مقام پر ہیں اس کو ایک لفظ میں فریاد و شکایت کا مقام کہا جا سکتا ہے۔ پچاس سال سے زیادہ مدت تک اس طرز کی پالیسی کو اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں مسلسل مدافعت کی زبان بولنی پڑی۔ ان کا کیس اس ملک میں مظلومانہ فریاد کا کیس بن گیا

۔ جو گروہ اس قسم کی نفسیات میں مبتلا ہو وہ کبھی کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ بڑا کارنامہ انجام دینے کے لئے اقدامی نفسیات درکار ہوتی ہے نہ کہ مدافعانہ نفسیات۔

خوش قسمتی سے اس ملک میں وہ اسباب اور مواقع پوری طرح موجود ہیں جو مسلمانوں کو مدافعانہ مقام سے اٹھا کر اقدامی سطح پر پہنچادیں۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ مواقع کو جانیں اور ان کو بھرپور طور پر استعمال کریں۔

مسلمانوں کو مظلومانہ پوزیشن سے اٹھ کر اقدامی پوزیشن تک پہنچنے کے لئے کیا کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا کام یہ ہے کہ اس رکاوٹ کو درمیان سے ہٹادیا جائے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے بڑے پیمانہ پر میل جول میں حائل ہیں۔ وہ ہے ملک کی اجتماعی سرگرمیوں میں بھارتیہ سنسکرتی کو غیر ضروری طور پر داخل کرنا۔ مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ حکیمانہ جدوجہد کے ذریعہ برادران وطن کو اس پر راضی کریں کہ وہ اپنی قدیم سنسکرتی کو صرف اپنے ذاتی دائرے میں محدود رکھیں، وہ اس کو اجتماعی پروگراموں یا سماجی سرگرمیوں میں دخیل نہ کریں۔ جس دن ایسا ہوگا اسی دن اپنے آپ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان انٹر ایکشن بڑھ جائے گا اور وہ مشترکہ جدوجہد وجود میں آجائے گی جس میں دونوں فرقے مل کر ہندستان کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کریں۔

جب یہ واقعہ پیش آئے گا تو اس کے بعد خود قانون فطرت کے تحت ایسا ہونے لگے گا کہ جو مسلمان کے پاس ہے وہ اس کو ہندوؤں تک پہنچائیں گے۔ اور جو ہندوؤں کو حاصل ہے اس کے ثمرات مسلمانوں تک پہنچنے لگیں گے۔ اس مشترکہ عمل کے نتیجہ میں اپنے آپ ایک نیا کلچر ابھرے گا۔ نئی زندگی تشکیل پائے گی۔ اس کے بعد اپنے آپ ایک نیا نظام بنے گا جو ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے مفید ہوگا۔

اس تاریخی عمل کو ظہور میں لانے کے سلسلہ میں دونوں ہی فرقوں کی اہم ذمہ داریاں ہیں۔ ہندو فرقہ کو یہ جاننا ہوگا کہ وہ کسی انسانی گروہ سے تو لڑ سکتا ہے مگر وہ فطرت سے

نہیں لڑ سکتا۔ بھارتیہ سنسکرتی کو ملک کی اجتماعی زندگی میں شامل کرنے کا منصوبہ اصلاً کسی انسانی گروہ کے خلاف نہیں۔ وہ فطرت اور تاریخ اور عالمی رجحان کے خلاف ہے۔ اس بنا پر وہ یقینی طور پر ناقابل عمل ہے۔

میں ایک بار مہاراشٹر کے ایک شہر میں گیا وہاں ایک ہندو اور ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ دونوں کے درمیان پہلے دوستی تھی، اس کے بعد دونوں میں ایک خاص مسئلہ میں نزاع ہو گئی۔ مہینوں کی کوشش کے باوجود جب یہ نزاع ختم نہ ہوئی تو ہندو نے مسلمان سے کہا کہ آؤ، ہم اپنے اختلاف کو بازو میں رکھ دیں اور بقیہ امور میں مل جل کر کام کریں۔ اسی قسم کا ایک قصہ بمبئی میں پیش آیا۔ یہاں ایک مسلمان اور ایک یہودی کے درمیان تجارتی اشتراک ہوا۔ یہودی نے پہلے ہی دن اپنے مسلم پارٹنر سے کہا کہ دیکھو میرے اور تمہارے درمیان تجارتی معاملات میں کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ ایک مسئلہ ایسا ہے جس میں میرے اور تمہارے درمیان اتفاق نہیں، وہ اسرائیل کا مسئلہ ہے۔ میں اور تم دونوں یہ طے کرلیں کہ ہم اسرائیل کے مسئلہ پر کبھی بات نہیں کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہودی اور مسلمان کا یہ تجارتی اشتراک نہایت کامیاب رہا۔

ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو وسیع تر اعتبار سے اسی فارمولے کو اختیار کرنا ہے۔ دونوں کے درمیان یہ امر مشترک ہے کہ ہندستان کو ایک ترقی یافتہ ملک بنایا جائے۔ اس کے بعد جو چیز اختلاف کی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس تعمیری عمل میں غیر ضروری طور پر بھارتیہ سنسکرتی کو شامل کیا جائے۔ اب ہندو فرقہ کو یہ کرنا ہے کہ وہ بھارتیہ سنسکرتی کو اپنے ذاتی دائرہ تک محدود رکھے۔ اس معاملہ میں ہندو فریق اگر اس تفریق پر راضی ہو جائے تو اس کے بعد متحدہ عمل کے لئے تمام دروازے پوری طرح کھل جائیں گے۔

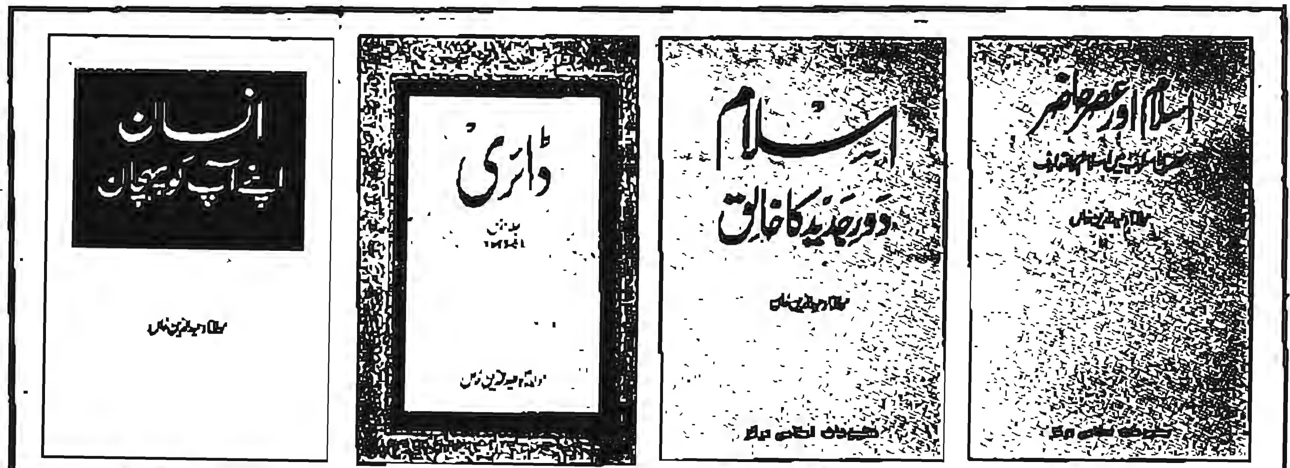
ایسا ہونا بے حد ضروری ہے۔ اس کے بغیر ہندو مسلم تعلقات صرف نو پرابلم ہندوؤں تک محدود ہو کر رہ جائیں گے۔ وہ پرابلم ہندوؤں تک وسیع نہ ہو سکیں گے۔ جب کہ پرابلم ہندوؤں

کو شریک کئے بغیر ملکی تعمیر کی کوئی بڑی جدو جہد زیر عمل نہیں لائی جا سکتی۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، انھیں بھی صرف ایک کام کرنا ہے۔ وہ یہ کہ ہندستان میں ہندو فرقہ اکثریت میں ہے اس بنا پر فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کچھ معاملات پیش آتے ہیں جن کو اب تک تعصب اور زیادتی کی اصطلاحوں میں بیان کیا جاتا رہا ہے۔ اس طرح کے واقعات ہر سماج میں اور ہمیشہ پائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ ان واقعات کو چیلنج کے روپ میں لیں۔ وہ ان کو کسی مخصوص فرقہ کی کارروائی سمجھنے کے بجائے فطرت کے نظام کے تحت پیش آنے والا واقعہ سمجھیں۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ کسی واقعہ کو ظلم سمجھنے سے شکایت کا مزاج بنتا ہے۔ اس کے برعکس جب واقعہ کو چیلنج سمجھا جائے تو خود فطری قانون کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ اس کی خفیہ قابلیت (latent potential) ظہور میں آنے لگتی ہے۔ پہلے اگر وہ صرف ایک انسان تھا تو اب وہ سپر انسان (superman) بن جاتا ہے۔ اس طرح وہ اس قابل بن جاتا ہے کہ اپنی بڑھی ہوئی استعداد کے ساتھ چیلنج کا مقابلہ کر کے کامیابی سے دوچار ہو۔

یہی وہ مخصوص مقام ہے جہاں لمبے تاریخی عمل کے بعد ہندو اور مسلمان دونوں پہنچے ہیں۔ اب بہترین عقل مندی یہ ہے کہ بیسویں صدی کے خاتمہ کے ساتھ قدیم غیر فطری پالیسی کو ختم کر دیا جائے۔ تاکہ جب آنے والی صدی کا سورج طلوع ہو تو وہ ہمارے لئے ایک نئے اور بہتر ہندستان کی خوش خبری کے ہم معنی بن جائے۔



ایک سیاسی جائزہ

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں مسلم قائدین نے جو تحریکیں چلائیں وہ وسیع تر تقسیم میں دو تھیں۔ ایک کو عام فہم زبان میں اتحاد ہند کی تحریک اور دوسری کو تقسیم ہند کی تحریک کہہ سکتے ہیں۔ بظاہر یہ دونوں تحریکیں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ دونوں کے اندر ایک مشترک خامی موجود تھی۔ اور وہ تھی حقیقی حالات کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ نہ کرنا۔

جن قائدین نے اتحاد ہند کی تحریک چلائی وہ سارے معاملہ کو انگریز اور ہندستانی کا مسئلہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سارے مسئلہ کی جڑ انگریز ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں ایک جان دو قالب ہیں۔ ان کے درمیان جھگڑے کا کوئی امکان ہی نہیں۔ یہ صرف انگریز ہیں جنھوں نے ایک کو دو میں بانٹ کر لڑا رکھا ہے۔ اسی تصور کو اقبال احمد سہیل نے ۱۹۴۷ سے پہلے ان الفاظ میں نظم کیا تھا۔

یوں شیشہ وساغر ٹکرائیں منہ دیکھتے میکش رہ جائیں
اس فن کو جہاں میں اور کوئی جز ساقی دانا کیا جانے

یہ اصل صورت حال کا نہایت سرسری اندازہ تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز ہی میں مختلف اسباب سے برادران وطن میں ہندو انتہا پسندی کی تحریک شروع ہو گئی تھی جو دن بدن طاقتور ہوتی چلی گئی۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد یقینی طور پر مسلمانوں کو ایک شدید تر خطرہ پیش آئے گا۔ یہ ہندو قوم پرستی یا ہندو انتہا پسندی کا خطرہ تھا۔

مگر اتحاد پسند مسلم قائدین نے اس خطرہ کے مقابلہ کے لئے کوئی تیاری نہیں کی۔ حتیٰ کہ انھوں نے یہ بھی نہیں کیا کہ مسلمانوں کو پیشگی طور پر اس خطرہ سے آگاہ کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ کے بعد جب مسلمانوں کو یہ خطرہ پیش آیا تو وہ صرف احتجاج یا منفی رد عمل کے درجہ میں اپنی کارروائیاں کرتے رہے۔ انھوں نے اس خطرہ کے مقابلہ میں نہ تو کوئی گہری منصوبہ بندی کی اور نہ اس کے مقابلہ میں وہ کوئی حقیقی عملی تدبیر کر سکے۔

ہندستان میں سماجی اتحاد کے لئے سیکولر فارمولا استعمال کرنا تھا۔ مگر اصل صورت حال یہ تھی کہ یہاں مختلف مذہبی گروہ موجود تھے اور ہر گروہ کے لیڈروں نے ان کے اندر پر شور طور پر یہ مزاج بنایا تھا کہ ۔۔۔۔ میں ہندو ہوں، میں مسلمان ہوں، میں سکھ ہوں، میں عیسائی ہوں وغیرہ۔ اس طرح یہاں کا مذہبی طبقہ شدت کی حد تک اس احساس میں مبتلا تھا کہ ہم ایک الگ مذہبی گروہ ہیں اور یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی علیحدہ شناخت (identity) کو سختی کے ساتھ قائم رکھیں۔

اس طرح کے سماج میں سیکولرزم کا اتحادی فارمولا کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی کامیابی کی لازمی شرط یہ تھی کہ یا تو لوگوں کے اندر گروہی تفریق کے مزاج کو ختم کیا جائے یا ان کے اندر یہ ذہن بنایا جائے کہ اپنی علیحدہ مذہبی حیثیت کو باقی رکھتے ہوئے انہیں دوسروں کا بھی پورا احترام کرنا چاہئے۔ مگر ذہنی اور فکری تربیت کا یہ کام انجام نہیں دیا گیا۔ صرف نعروں اور تقریروں کے ذریعہ یہ امید کر لی گئی کہ لوگوں کے درمیان سیکولر اتحاد قائم ہو جائے گا۔ حقیقی حالات کے اعتبار سے یہ ناممکن تھا اس لئے وہ حاصل بھی نہ ہو سکا۔

یہی معاملہ نئے مسلم ملک (پاکستان) میں ایک اور شکل میں پیش آیا۔ جس خطہ میں پاکستان بنا وہاں مختلف بنیادوں پر زبردست گروہی احساسات موجود تھے۔ یہاں کے لوگ

انھیں احساسات میں جی رہے تھے۔ میں بنگالی ہوں، میں پنجابی ہوں، میں سندھی ہوں، میں بلوچی ہوں، میں سنی ہوں، میں شیعہ ہوں وغیرہ۔

ان تفریقی احساسات کو ختم کرنے یا ان کو غیر موثر بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ البتہ یہ کوشش کی گئی کہ نعروں اور تقریروں کی دھوم کے ذریعہ اسلام کو پورے ملک کے لئے اتحاد کی اساس بنادیا جائے۔ عالم اسباب میں ایسا ہونا ممکن نہ تھا اس لئے وہ کامیاب بھی نہیں ہوا۔

اسلام بلاشبہ انسانوں کو متحد کرنے کی طاقت رکھتا ہے مگر اسلام کی یہ کرامت اسی وقت ظاہر ہو سکتی ہے جب کہ لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں اسلام کو پوری طرح اتار دیا جائے۔ خارجی نعروں اور اوپری تقریروں کے ذریعہ یہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک تقسیم ہند کے حامی قائدین کا تعلق ہے وہ بھی اسی طرح کے بھرم میں مبتلا رہے۔ انھوں نے سمجھا کہ سارا معاملہ ہندو قوم اور مسلم قوم کے باہمی اختلاف کا ہے۔ اور اس کا آسان حل یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جغرافی تقسیم کردی جائے ۔جب ہندو الگ ہوگا اور مسلمان الگ تو اپنے آپ تمام جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔

مگر یہ اصل صورت حال کا ایک غیر حقیقی اندازہ تھا۔ حقیقی حالات کے اعتبار سے اصل صورت حال یہ تھی کہ تقسیم کا نتیجہ صرف یہ نکلے کہ جو مسائل پہلے ہندو اور مسلمان کے درمیان تھے وہ تقسیم کے بعد نئے مسلم ملک میں مسلم اور مسلم کے درمیان مزید اضافہ کے ساتھ ابھر آئیں۔ ۱۹۴۷ کے بعد نئے مسلم ملک میں عملاً ایسا ہی پیش آیا۔ ہر وہ نزاع جس کا ذکر پہلے ہندو کی نسبت سے کیا جاتا تھا وہ نئے ملک میں خود مسلمانوں کی نسبت سے بہت بڑے پیمانے پر پیدا ہو گئی۔

۱۹۴۷ سے پہلے کچھ ایسے دانش ور موجود تھے جو دونوں گروہوں کو آنے والے خطرے سے ڈراتے تھے۔ اتحاد ہند کے قائدین کو ہندو انتہا پسندی کے خطرہ سے اور تقسیم ہند کے قائدین کو خود مسلمانوں کی نسل پسندی اور علاقہ پسندی کی ذہنیت سے۔ مگر دونوں گروہوں نے اس انتباہ کو نظر انداز کیا۔

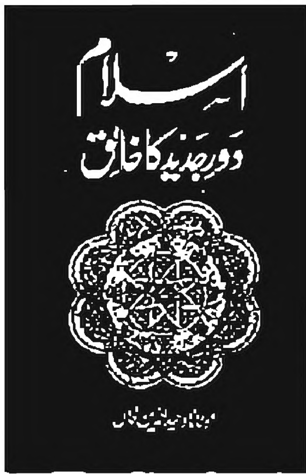
اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں اس بھرم میں مبتلا تھے کہ ان کے پاس اتحاد کا ایسا فارمولا موجود ہے جو ہر افتراق کی کاٹ کے لئے کافی ہے۔ اتحاد پسند قائدین سمجھتے تھے کہ ان کے پاس سیکولرزم کا تیر بہدف فارمولا موجود ہے۔ اور سیکولرزم کے نظریہ کے تحت ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک رشتہ میں جوڑ کر متحد کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف تقسیم ہند کے قائدین یہ سمجھتے تھے کہ ان کے پاس اسلام کا معیاری نظریہ ہے جو مختلف مسلم گروہوں کو ایک رشتہ میں باندھنے کے لئے کافی ہے۔ مگر تجربات بتاتے ہیں کہ یہ دونوں ہی خوش فہمی بے بنیاد ثابت ہوئی۔ نہ ہندستان میں سیکولرزم یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک رشتہ میں متحد کر سکا اور نہ پاکستان میں اسلام کے نعرہ کا یہ فائدہ ہوا کہ وہاں کے مختلف مسلم گروہ باہم متحد ہو کر رہیں۔

اس تلخ انجام کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ سیکولرزم یا اسلام میں لوگوں کو متحد کرنے کی طاقت نہیں۔ سیکولرزم اور اسلام دونوں ہی کسی سماج میں اتحادی فورس بن سکتے ہیں۔ مگر وہ اتحادی طاقت اسی وقت بنیں گے جب کہ انہیں استعمال کیا جائے۔ ہندستان اور پاکستان کے اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ دونوں میں سے کسی نظریہ کو صحیح طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔

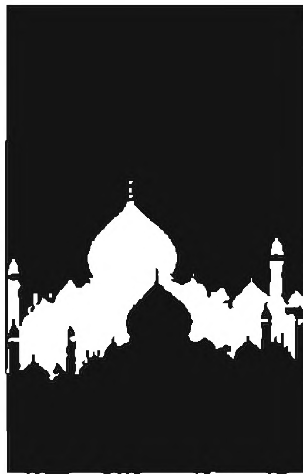
ہندستان پاکستان دونوں ملکوں میں جو ہوا وہ یہ تھا کہ یہاں سیکولرزم کے نعرے

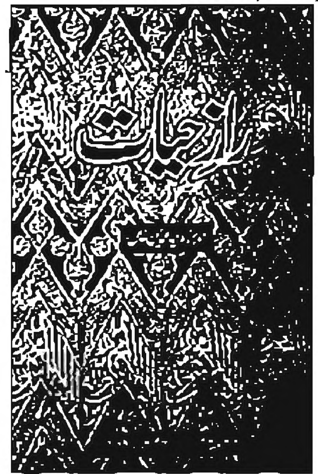
لگائے گئے اور پاکستان میں اسلام کے نعرے۔ اور کسی نعرہ کو سماجی اتحاد کے لئے استعمال کرنا صرف اس وقت ممکن تھا جب کہ وہاں لمبی مدت تک فکری تحریک کا کام کیا جائے، سماج کے افراد اس سے متاثر ہوں۔ اور سماج میں پیش نظر منصوبہ کے موافق ضروری ذہنی فضا تیار ہو جائے۔

یہ کام اس حد تک ہو کہ پورا سماج مطلوب اسکیم کو قبول کرنے کے لئے فکری اور مزاجی طور پر تیار ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں فطرت کے مطابق اصلاح کا اصول یہ ہے کہ۔۔۔ پہلے ایجوکیشن، اس کے بعد اقدام۔ یہی کسی اصلاح کی صحیح ترتیب ہے۔ مگر انڈیا اور پاکستان میں جو ہوا وہ انگریزی مثل کے مطابق، گاڑی کو گھوڑے کے آگے باندھنے کے ہم معنی تھا۔ اور جو لوگ اپنی گاڑی کو گھوڑے کے آگے باندھیں۔ ان کی گاڑی اس عالم اسباب میں کبھی چلنے والی نہیں۔

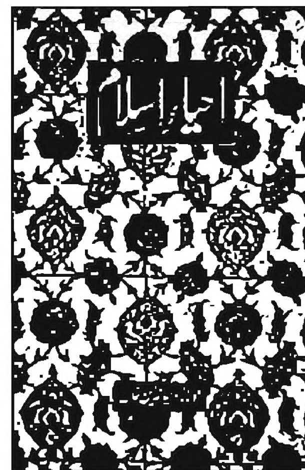


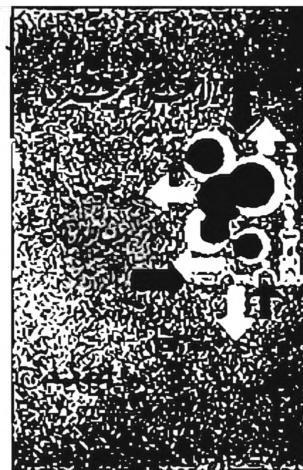


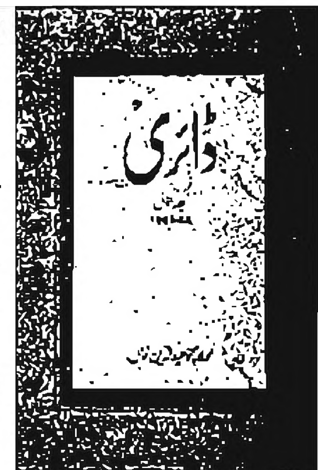


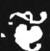










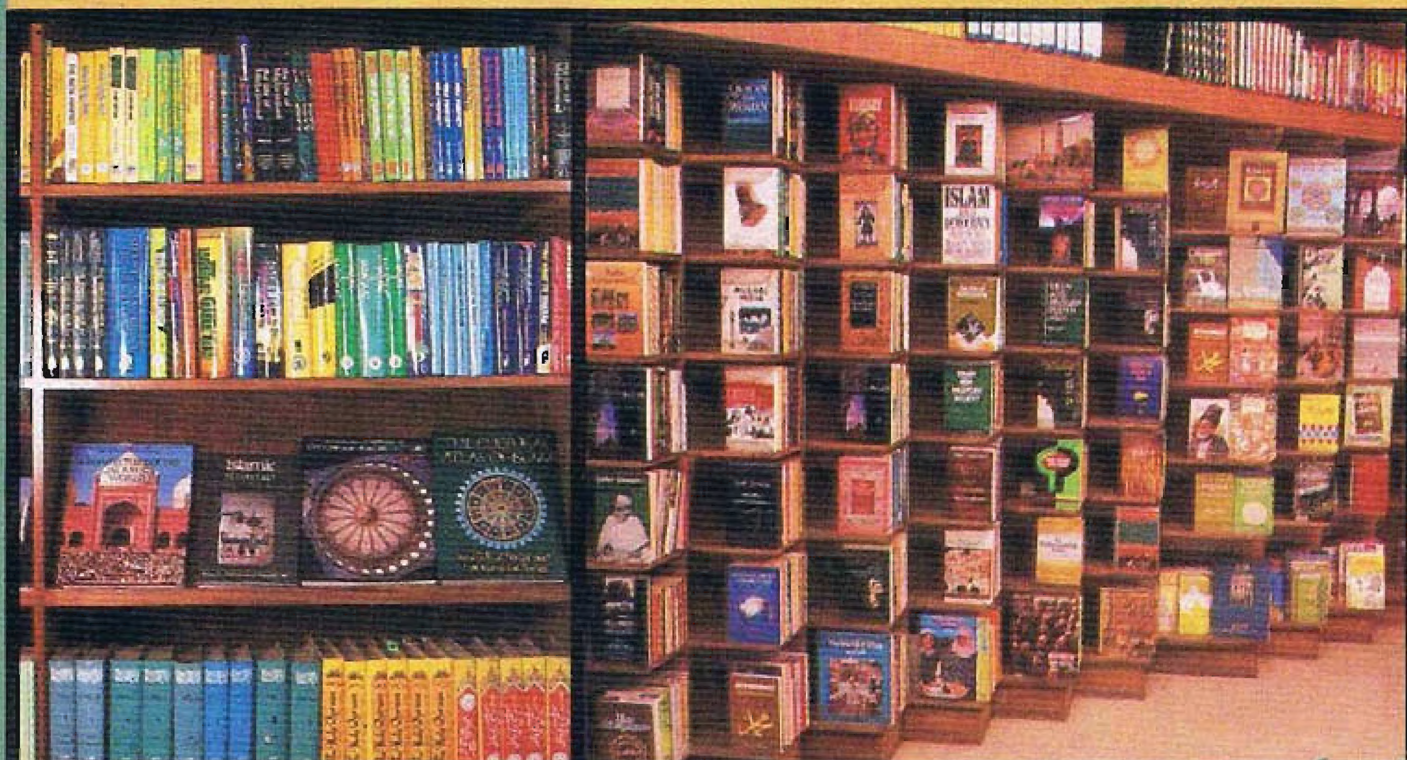
 ISLAMIC BOOKS 

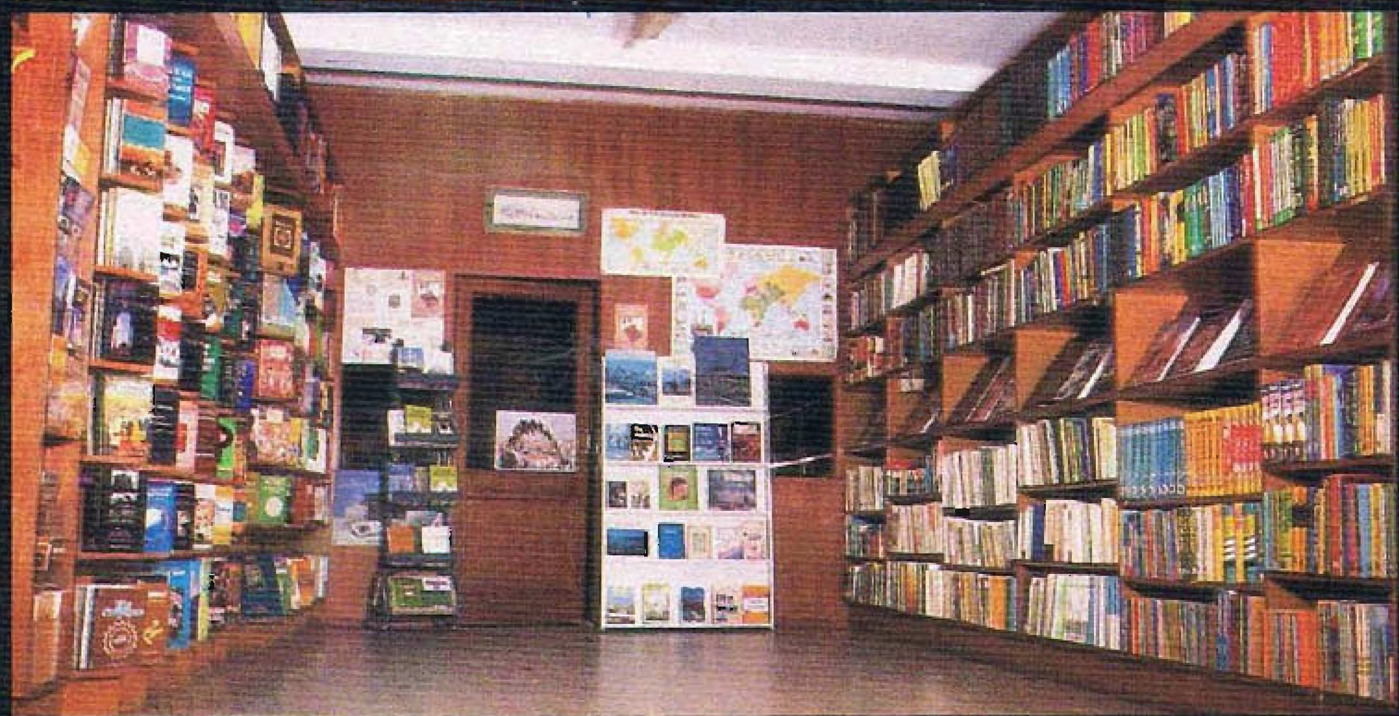
Books by Maulana Wahiduddin Khan

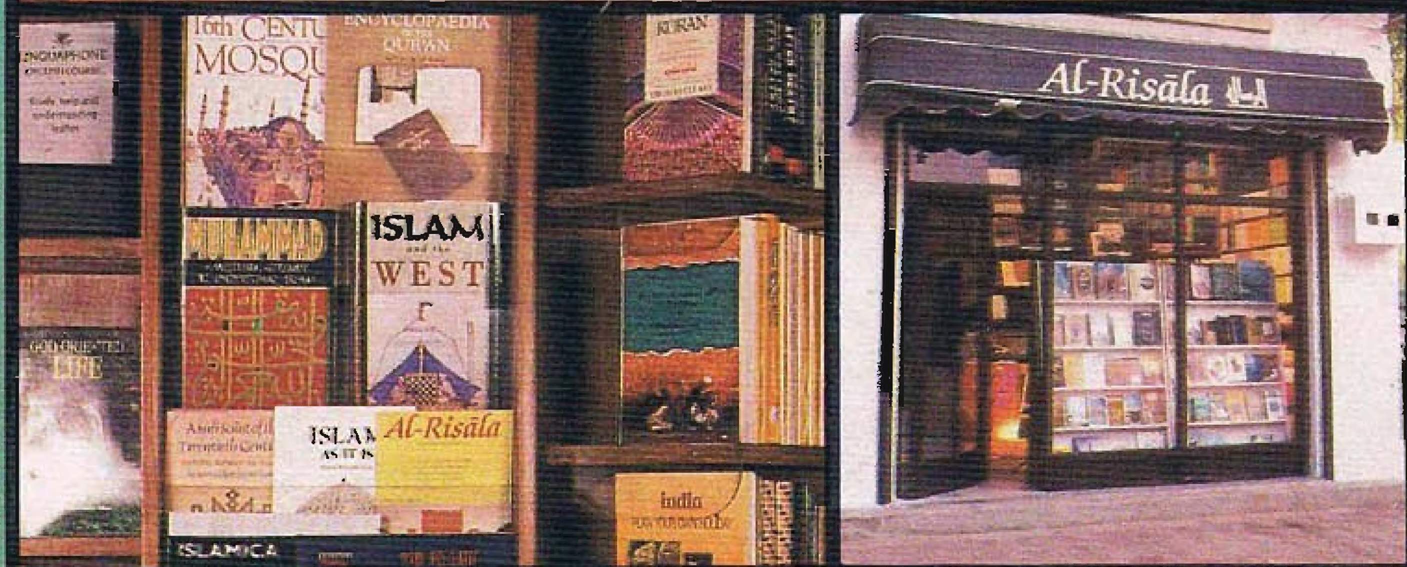
slam and Peace	Rs. 150.00
Principles of Islam	145.00
The Quran for All Humanity	75.00
ndian Muslims	65.00
slam and Modern Challenges	95.00
slam: The Voice of Human Nature	40.00
slam: Creator of the Modern Age	55.00
Woman Between Islam and Western Society	145.00
Woman in Islamic Shari'ah	80.00
slam As It Is	55.00
An Islamic Treasury of Virtues	195.00
Religion and Science	45.00
Man Know Thyself	8.00
Muhammad: The Ideal Character	8.00
Tabligh Movement	40.00
Polygamy and Islam	7.00
Hijab in Islam	20.00
Concerning Divorce	7.00
The Way to Find God	25.00
The Teachings of Islam	50.00
The Good Life	45.00
The Garden of Paradise	45.00
The Fire of Hell	45.00
Islam and the Modern Man	25.00
Uniform Civil Code	10.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity	195.00
A Treasury of the Qur'an	75.00
Words of the Prophet Muhammad	75.00
Qur'an: An Abiding Wonder	125.00
The Call of the Qur'an	95.00
No End to Possibilities	145.00
Introducing Islam	195.00

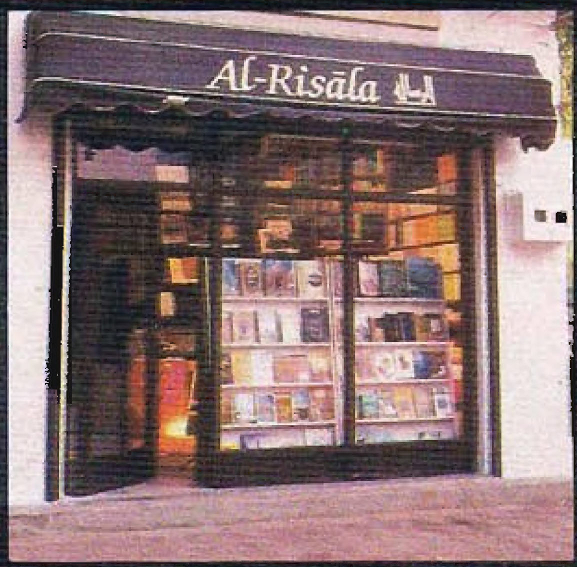
The Qur'an Tr. T.B. Irving	Rs. 295.00
The Koran Tr. M.H. Shakir	195.00
Heart of the Koran by Lex Hixon	195.00
The Moral Values of the Quran by Harun Yahya	125.00
The Essential Arabic by Rafi'el-Imad Faynan	200.00
Presenting the Qur'an by Saniyasnain Khan	125.00
The Wonderful Universe of Allah by Saniyasnain Khan	85.00
The Soul of the Qur'an by Saniyasnain Khan	145.00
Tell Me About Hajj by Saniyasnain Khan	295.00
The Muslim Prayer Encyclopaedia Ruqaiyyah Waris Maqsood	325.00
After Death, Life! Ruqaiyyah Waris Maqsood	195.00
Living Islam: Ruqaiyyah Waris Maqsood	295.00
A Basic Dictionary of Islam Ruqaiyyah Waris Maqsood	295.00
The Muslim Marriage Guide Ruqaiyyah Waris Maqsood	250.00
The Beautiful Commands of Allah Ruqaiyyah Waris Maqsood	125.00
The Beautiful Promises of Allah Ruqaiyyah Waris Maqsood	175.00
Muslim Travel Guide (Forthcoming) Ruqaiyyah Waris Maqsood	—
Muhammad: A Mercy to all the Nations by Q. A. Jairazbhoy	250.0[illegible]
A-Z Steps to Leadership by Abdul Ghani Ahmed Barrie	95.00
The Sayings of Muhammad by Sir Abdullah Suhrwardy	75.00
The Life of the Prophet Muhammad by Mohd. Marmaduke Pickthall	75.00

Finest collection of books on Islam









AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013

Tel. 4611128 Fax 4697333